مولانا مسعود عالم ندوی

حیات اور کارنامے

ڈاکٹر عبدالحمید فاضلی

مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی ۲۵

مولانا مسعود عالم ندوی

حیات اور کارنامے

ڈاکٹر عبدالحمید فاضلی

مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی۔ ۲۵

مطبوعات ہیومن ویلفیر ٹرسٹ ۱۶۲

مولانا مسعود عالم ندوی: حیات اور کارنامے

از ڈاکٹر عبدالحمید فاضلی

MAULANA MASOOD ALAM NADVI
HAYAT AUR KARNAME
By Dr. Abdul Hameed Fazli
Pages :251 Price Rs. 60.00

نظر ثانی وادارت: مولانا محمد ارتضاء الدین حاذق ضیائی، سہسرام
اور محمد ارشد

اشاعت

طبع اول جولائی ۱۹۹۸ء ۱۰۰۰

قیمت: ـ/۶۰ روپے

ناشر

مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز

ڈی ۳۰۷، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، اوکھلا، نئی دہلی ـ ۲۵ فون: ۶۹۱۱۶۵۲

فہرست موضوعات

باب دوم

باب سوم

باب چہارم

باب پنجم

باب ششم

●●●

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

ہندوستان میں عربی زبان وادب کی تاریخ بہت قدیم ہے، اسلام کی آمد اور عرب تاجروں کی سکونت واستقرار کے بعد سے ہی عربی زبان وادب کے درس وتدریس کا سلسلہ شروع ہوا۔ اسلام اور عربی زبان کا رشتہ ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم کی حیثیت رکھتا ہے، کسی عہد اور کسی ملک میں بھی یہ رشتہ منقطع نہ ہوسکا، اس کی اہم وجہ عربی زبان میں قرآن مجید کا نزول ہے، اور مسلمانوں کے لیے قرآن مجید سے بڑھ کر کوئی بھی کتاب قابل احترام نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں نے قرآن مجید ہی کی نسبت سے عربی زبان کو سینے سے لگایا اور اس کی درس وتدریس میں اہم اور نمایاں کردار ادا کیا۔ نیز تصنیف وتالیف کے میدان میں بھی نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ مثال کے طور پر عربی زبان وادب کے مشہور ادیب اور تاج العروس کے مصنف علامہ سیّد مرتضٰی بلگرامی (م ۱۲۰۵ھ) اسی ہندوستان کے ایک ممتاز فرد تھے، اس کے علاوہ یہاں کے علماء نے دوسرے علمی میدانوں میں بھی اپنی ذہانت اور صلاحیت سے کام لیا ہے۔

میر غلام علی آزاد بلگرامی نے فن بلاغت اور فن عروض میں نئے نئے اضافے کیے اور عربی شاعری میں نئی پیش رفت کی۔ جسٹس کرامت حسین لکھنوی اور مولانا سیّد سلیمان اشرف بہاری نے "فقہ اللسان" اور "المبین" کے ذریعہ عربی زبان کے فلسفہ لغت اور نحو واشتقاق کے بہت سے اسرار کی نقاب کشائی کی اور اپنی سلاست ذوق اور جودت طبع کے نادر نمونے پیش کیے۔ (۱)

آٹھویں صدی ہجری سے لے کر بارہویں صدی ہجری تک کا زمانہ عربی زبان و

(۱) عربی ادب کی تاریخ ص : ۱۰

ادب کے اعتبار سے خود عرب ممالک میں انحطاط و تنزل کا دور تھا۔ لہذا طبعی طور پر ہندوستان میں بھی اس دور میں عربی زبان و ادب پر تاریک بادل چھائے رہے، جمود اور ظلمت کا یہ دور اس وقت ختم ہوتا دکھائی دیا جبکہ تیرھویں صدی ہجری کے آغاز میں یورپ کے علوم وفنون سے عرب ممالک آشنا ہوئے۔ آہستہ آہستہ عربوں کو احساس ہوا، اور انہوں نے عربی زبان وادب کی طرف توجّہ دینی شروع کی، یہاں تک کہ چودھویں صدی ہجری میں عربی زبان وادب کو کافی فروغ حاصل ہوا۔ اس صدی میں زبان وادب کی تجدید ہوئی اور اس زمانے میں عربی کے بے شمار ادیب، انشا پرداز، صحافی، شاعر اور نقاد پیدا ہوئے، جنہوں نے اپنے علم و حکمت سے عربی زبان وادب کو مالا مال کیا، مثال کے طور پر سیّد جمال الدین افغانی، مفتی محمد عبدہ، سیّد رشید رضا اور امیر شکیب ارسلان وغیرہ۔ اس کا فطری اثر ہندوستانی معاشرے اور یہاں کے علمی وادبی حلقوں پر پڑنا لازمی تھا، چنانچہ انیسویں صدی عیسویں کے اخیر اور بیسوی صدی عیسوی کے آغاز میں ہندوستان میں بھی متعدد علمی وادبی شخصیات ابھر کر سامنے آئیں، اور ان میں سے بعض، بڑے بڑے اہل فکر اور ارباب علم و ادب سے بھی آگے نکل گئیں، مثال کے طور پر علّامہ عبدالعزیز میمنی، علّامہ شبلی نعمانی اور علامہ سیّد سلیمان ندوی وغیرہم یہ عربی زبان وادب کی وہ شخصیات تھیں جنہوں نے اُس دور میں ہندوستان میں عربی زبان کا جھنڈا بلند کیا، اور عربی زبان کی درس و تدریس کا ایک سلسلہ شروع کیا، اسی طبقہ کے زیر سایہ مولانا مسعود عالم ندوی نے اپنا سفر شروع کیا۔

مولانا مسعود عالم ندوی کا تعلق ہندوستان کے مشہور صوبے بہار سے تھا، اور وہاں کی سر زمین نے ایسی ایسی ہستیوں کو جنم دیا ہے جن پر تاریخ کو فخر ہے۔ یہاں سیاست وصحافت، ادب و سائنس، تاریخ ودینیات غرض کہ ہر میدان میں اصحاب فکر و دانش پیدا ہوتے رہے۔ جہاں تک دینی علوم و فنون کا تعلق ہے، خدمت دین اور اعلاء کلمۃ اللّٰہ کا معاملہ ہے تو اس میدان میں سر زمین بہار نے زیادہ ہی سخاوت وفیّاضی کا مظاہرہ کیا ہے۔ ایک سے ایک دینی فہم وبصیرت کے افراد پیدا ہوئے۔ مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا سیّد سلیمان ندوی اور مولانا مسعود عالم ندوی کا نام ان میں سر فہرست ہے۔ یہ اپنے وقت کے وہ نامور علماء تھے، جن کی

خدمات کا اعتراف بر صغیر ہند و پاک ہی کو نہیں بلکہ پورے عالم اسلام کو ہے۔ یہ علماء پوری ملت اسلامیہ کا ایک عظیم سرمایہ ہیں۔ ان کے علمی کارناموں کو منظر عام پر لانا تمام عالم اسلام کی ایک اہم ذمہ داری ہے۔ مولانا مناظر احسن گیلانی اور مولانا سیّد سلیمان ندوی کے کارناموں اور ان کی علمی خدمات سے تو عالم اسلام قدرے آشنا ہوا۔ لیکن بد قسمتی سے مولانا مسعود عالم ندوی کی خدمات اور ان کی علمی شخصیت خاص طور سے عربی زبان وادب میں ان کا جو مقام ہے اس سلسلے میں ابھی تک کوئی وقیع تحقیقی کام نہیں کیا جاسکا ہے۔ آپ کی علمی شخصیت مظلومیت کی شکار رہی۔ گرچہ ان سے گہرا تعلق رکھنے والے بعض حضرات نے اپنے تأثرات قلم بند کیے ہیں۔ اور کچھ مضامین ان کی شخصیت پر لکھے بھی گئے جو مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں لیکن ان کی مکمل سوانح حیات پر آج تک شاید کسی نے قلم نہیں اٹھایا، حالانکہ عربی زبان وادب میں آپ کا جو مقام ومرتبہ ہے اس کا بہت سے لوگ تصور بھی نہیں کر سکتے، عرب کے ممتاز ادباء کے درمیان آپ نے اپنی جگہ بنائی تھی۔ ندوۃ العلماء کا علمی، ادبی ودینی ترجمان ''الضیاء'' جس کے آپ مدیر تھے، ادیبوں کے درمیان ایک اہم مقام حاصل کر چکا تھا۔ اس کو پڑھ کر علمائے عرب جھومتے تھے۔ عرب علماء اپنی تحریروں اور تصانیف میں آپ کی عبارت نقل کرتے تھے۔ تمام ادبی رسالوں نے اس پر تعریفی تبصرے شائع کیے، اور اس بات پر وہ زیادہ حیران تھے کہ ہندوستان سے نکلنے والے اس عربی رسالے کی زبان عرب ممالک سے نکلنے والے رسالوں سے بدرجہا بہتر ہوتی ہے۔

عربوں نے مولانا مسعود عالم ندوی کے مقام ومرتبہ کو پہچانا، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ حکومت سعودی عرب نے عربی زبان کے اس ہندوستانی انشاء پرداز کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ایک سڑک کا نام ''شارع مسعود عالم ندوی'' رکھا ہے۔ لیکن افسوس کہ خود اپنے ملک میں مسعود صاحب گم نام ہیں۔

اس کی میرے نزدیک کئی وجوہات ہیں۔ اول یہ کہ مولانا نے کہیں ایک جگہ مستقل قیام نہیں کیا، ایک عرصہ ندوۃ العلماء میں ''الضیاء'' کے ایڈیٹر اور عربی ادب کے استاد کی حیثیت سے قیام فرمایا اور سات سال کا ایک طویل زمانہ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں کیٹلاگر کی

حیثیت سے گزارا۔ اس کے بعد جماعت اسلامی کی فکر سے مکمل ہم آہنگی ہوئی تو جماعت اسلامی کے رکن بن کر پاکستان چلے گئے، اور آخر دم تک جماعت ہی کے ساتھ وابستہ رہے۔ طالب علمی کے زمانے میں ندوۃ العلماء کی علمی و ادبی فضا میں خوب کسب فیض کیا، لیکن بحیثیت استاد اور مدیر ''الضیاء'' وہ اگرچہ ابتداء میں خوش رہے اور اہل ندوہ سے کوئی شکایت نہ ہوئی، لیکن ''الضیاء'' کے بند ہونے کے بعد وہ اپنے لیے ندوہ کی زمین تنگ محسوس کرنے لگے۔ اسی زمانہ میں ندوہ کے طلباء نے اسٹرائک کی، جس کے نتیجے میں بعض اساتذہ کو ندوہ سے نکالا گیا، مسعود صاحب کو اگرچہ نکالا نہیں گیا لیکن احاطۂ دار العلوم سے باہر رہنے کا حکم ہوا، اور پھر جماعت اسلامی کے ساتھ ان کی مکمل فکری ہم آہنگی اہل ندوہ کے لیے قابل قبول نہ تھی، اس لیے وہ ندوہ کے ماحول سے دور پٹنہ کی خدا بخش لائبریری چلے گئے۔ جماعت اسلامی کے ساتھ مکمل فکری ہم آہنگی کی وجہ سے ندوۃ العلماء نے اب تک مولانا پر کوئی تحقیقی کام نہیں کیا ہے، ورنہ عربی زبان وادب میں جو گراں مایہ خدمات مولانا نے انجام دی ہیں اور جس طرح سے ندوۃ العلماء کے نام کو پورے عالم عرب کے کونے کونے تک پہنچا دیا، اس کو دیکھتے ہوئے مولانا کی شخصیت سے بے اعتنائی کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔

خدا بخش لائبریری میں اگرچہ مختلف شخصیات پر تحقیقی کام ہو رہا ہے، اور بہت بڑے پیمانے پر وہاں تحقیق و تصنیف کی سرگرمیاں جاری ہیں لیکن یہاں بھی مولانا پر کوئی کام نہیں ہوا ہے۔ اس کے علاوہ ایک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ مولانا نے بہت ہی کم عمر پائی، اکثر حضرات حتیٰ کہ ان کے گہرے دوستوں کو بھی ان کے ابتدائی حالات سے آگاہی نہیں ہے۔ مولانا تواضع وانکساری کا ایک نمونہ تھے۔ انہوں نے کبھی اپنی شخصیت کو موضوع بحث نہ بنایا، اور نہ ہی بننے دیا، اور اپنے حالات کو بھی قلم بند نہیں کیا۔

دیار عرب کے قیام کے دوران جب طٰہٰ فیاض ایڈیٹر ''السجل'' (بغداد) نے حالات زندگی دریافت کیے اور خواہش ظاہر کی کہ وہ اپنے اخبار میں ان کا تعارف کرانا چاہتے ہیں، تو مولانا نے انتہائی تواضع اری سے کہا:

میری کوئی زندگ ں اور نہ سوانح حیات قابل ذکر ہے۔ بس ایک طالب علم کی زندگی بسر

ہورہی ہے۔

ذرا غور کیجئے کہ بیسویں صدی میں جب ہر ایک اپنی شخصیت کو ابھارنا چاہتا ہے، اپنے کارناموں کو بڑھاچڑھاکر پیش کرتا ہے اخبارات و جرائد میں چھپنے کا خواہش مند رہتا ہے اور خود اپنے حالات قلم بند کرکے اخبار و جرائد میں بغرض اشاعت روانہ کرتا ہے۔ مسعود صاحب اس نام و نمود سے کوسوں دور تھے۔

ان وجوہات کی بنا پر مولانا کی سوانح حیات لکھنا ایک مشکل کام ہے، اور مواد کی عدم فراہمی بھی اس راہ میں حائل ہوتی ہے۔

میں نے مولانا مسعود عالم ندوی کا نام سب سے پہلے ندوۃ العلماء میں اس وقت سنا تھا جب میں عربی چہارم کا طالب تھا۔ "منثورات" کے درس کے دوران اساتذہ بعض اوقات مولانا مسعود عالم ندوی کا نام بحیثیت ایک عربی ادیب کے لیتے لیکن اس سے زیادہ ان کی شخصیت کے بارے میں کچھ اور معلوم نہ ہوسکا۔ عربی پنجم میں ایک دن دوران درس "جماعت اسلامی" کا تذکرہ آنکلا تو ایک استاد نے از راہ نصیحت کہا کہ جماعت اسلامی کی دعوت موجودہ دور میں دین سے بہت دور ہے اور ابتدا میں جو لوگ مولانا مودودی کے ساتھ تھے وہ آہستہ آہستہ اس تحریک سے الگ ہوگئے اس پر ایک طالب علم نے مولانا مسعود عالم ندوی کے بارے میں بتایا کہ وہ تو آخر تک اس تحریک کے ایک اہم رکن رہے اور جماعت کی دعوت سے عالم عرب کو انہوں نے ہی متعارف کرایا ہے تو اس پر استاد محترم نے فرمایا نہیں آخر عمر میں وہ جماعت سے نکل گئے تھے۔اور عملاً اسے چھوڑ دیا تھا۔زیادہ معلومات نہ ہونے کے سبب تمام طلبا اس پر خاموش رہے۔

اس کے بعد بھی وقتاً فوقتاً مولانا مسعود عالم ندوی کے بارے میں جاننے کی کوشش کی لیکن کوئی خاص کامیابی نہیں ملی البتہ بعض دوسرے اساتذہ سے اتنا ضرور معلوم ہوا کہ مولانا آخری وقت تک جماعت سے وابستہ رہے اور اس حالت میں انتقال ہوا جب وہ جماعت کی شوریٰ کے اجلاس میں شریک تھے۔

۱۹۸۶ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ عربی میں ایم اے میں داخلہ لیا۔ اسی

دوران حکومت ہند کی جانب سے عربی میں ریسرچ کے لیے اسکالر شپ کا اعلان ہوا تو استاذ محترم ڈاکٹر عبدالباری سے مل کر "مولانا مسعود عالم ندوی، حیات اور کارنامے" کے موضوع پر ریسرچ کی خواہش ظاہر کی وہ بہت خوش ہوئے اور رہنمائی کا وعدہ فرمایا۔ ابتدا میں مولانا کے متعلق معلومات کی فراہمی بڑی مشکل نظر آئی لیکن حسن اتفاق سے "چراغ راہ" کا ایک خصوصی نمبر جو مولانا کے انتقال کے فوراً بعد ان کی شخصیت اور کارناموں پر شائع ہوا تھا، ہاتھ لگ گیا۔ اس نے میرا کام ایک حد تک آسان کر دیا اور اس کے بعد مولانا کی زندگی سے متعلق مزید معلومات فراہم ہوتی گئیں۔

تلاش و تحقیق کے دوران یہ حقیقت سامنے آئی کہ مولانا مسعود عالم ندوی کو جو مقام ہندوستان میں ملنا چاہیے تھا، بالمخصوص عربی ادب کے تعلق سے وہ ہنوز ملنا باقی ہے۔ ان سے قلبی تعلق رکھنے والوں نے بعض مضامین ان کی شخصیت کے حوالے سے ضرور لکھے ہیں لیکن وہ مکمل سوانح حیات تو نہیں بن سکتے۔ عربوں نے تو اس ہندوستانی انشاء پرداز کی قدر کرتے ہوئے سعودی عرب میں ایک سڑک کا نام "شارع مسعود عالم ندوی" رکھ دیا لیکن خود اپنے وطن میں مولانا مسعود عالم ندوی گمنام ہیں۔ بالخصوص ندوۃ العلماء کی مولانا کی شخصیت سے بے اعتنائی کی کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آئی کیوں کہ مولانا ہی وہ پہلی شخصیت ہیں جنہوں نے الضیاء کے ذریعے ندوۃ العلماء کو عالم عرب کے گوشے گوشے میں متعارف کرایا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ سمجھ میں آتی ہے کہ مولانا کہیں ایک جگہ مستقل نہیں رہے دوسرے مولانا نے عمر بہت کم پائی اور پھر مزید یہ کہ مولانا کے حالات زندگی بہت کم کسی کو معلوم تھے۔ مولانا کی طبیعت کی انکساری نے ہمیشہ انہیں نام و نمود سے کوسوں دور رکھا۔ عرب ممالک میں قیام کے دوران "السّجل" (بغداد) کے ایڈیٹر طٰہٰ فیاض نے اپنے اخبار میں تعارف شائع کرنے کے لیے مولانا سے حالات زندگی دریافت کیے تو مولانا نے انتہائی انکساری سے کہا "میری کوئی زندگی نہیں اور نہ سوانح حیات قابل ذکر ہے بس ایک طالب علم کی زندگی بسر ہو رہی ہے۔"

●●

باب اول

حالاتِ زندگی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ابتدائی احوال

ولادت

مولانا مسعود عالم ندوی ۲۱ محرم الحرام ۱۳۲۸ھ مطابق ۱۱ فروری ۱۹۱۰ کو صوبہ بہار کے ایک دیہات ''اوگاؤں'' میں پیدا ہوئے۔ یہ گاؤں ضلع پٹنہ کے ایک قصبہ بہار شریف کے مضافات میں واقع ہے۔ (اب یہ گاؤں ضلع نالندہ (پٹنہ کمشنری) کا ایک حصہ ہے)۔(۱)

خاندان

مولانا مسعود عالم ندوی ایک سیّد خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ آپ کا خاندان پورے علاقے میں زہد و تقویٰ اور دینداری کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ آپ کے خاندان کے اکثر بزرگوں کا شمار اپنے زمانے کے بڑے جیّد علماء دین میں ہوتا تھا، خود آپ کے والد ماجد مولانا سید عبدالفتح عبدالشکور صوبہ بہار کے چند بلند پایہ اور جید علماء میں ایک معروف شخصیت تھے۔ نیز آپ دست شفا طبیب حاذق تھے۔ نیز موصوف ایک مدت تک مئوناتھ بھنجن (اعظم گڑھ) کے ایک مدرسے کے صدر مدرس رہے۔ نیز موصوف سے طالبان علوم نبوّت نے آپ سے مدّتوں خوب کسب فیض کیا۔ صوبہ بہار کے بہت سے علماء آپ کے یا آپ کے شاگردوں کے شاگرد تھے۔ آپ کے دادا مولانا سیّد خدا بخش بھی اپنے وقت کے ایک مشہور

---

(۱) ماہنامہ چراغ راہ، مسعود عالم ندوی نمبر ص : ۱۲۹

عالم دین تھے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ان کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا تھا، تبلیغ دین کا انتہائی جذبہ رکھتے تھے اور جہاں موقع ملتا اللہ کے بندوں کو دین کا پیغام پہنچاتے۔ سال کو آپ نے دو حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ چھ ماہ کھیتی باڑی کی دیکھ بھال کرتے، بقیہ چھ ماہ خدمتِ دین اور اعلاء کلمۃ اللہ کی نیت سے تمام قرب و جوار کی بستیوں میں گھوم گھوم کر کتابیں فروخت کرتے اور لوگوں کو پڑھنے کی تلقین کرنے کے ساتھ ساتھ دین کی بنیادی اور اہم باتیں گوش گزار کرتے۔

مولانا مسعود عالم ندوی کی ولادت سے قبل ان کے پانچ بھائیوں کا بچپن ہی میں انتقال ہو چکا تھا، پیدائش کے وقت ان کے صرف ایک بھائی اور ایک بہن بقید حیات تھیں، لیکن اٹھارہ سال کی عمر کو پہونچ کر بڑے بھائی کا بھی انتقال ہو گیا، بہن جو عمر میں مولانا سے صرف دو سال بڑی تھیں، شادی کے کچھ عرصہ بعد اللہ کو پیاری ہو گئیں، اس طرح ابتداء ہی سے موصوف نے اپنے گھر کو ہمیشہ بصورتِ ماتم کدہ دیکھا۔ خود موصوف کی پرورش بھی تنگدستی کی حالت میں ہوئی۔ لیکن ان تمام مصائب کو آپ نے خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔

ابتدائی تعلیم

مولانا مسعود عالم ندوی کے والد ایک خداترس اور علم دوست انسان تھے۔ اسی لیے تمام مصائب کے باوجود انہوں نے آپ کے ہوش سنبھالتے ہی تعلیم و تربیت کی جانب خاص توجہ دی، اور اپنی ہی زیر نگرانی تعلیم و تربیت کا سلسلہ شروع کیا، کیونکہ گاؤں میں ایسا کوئی مدرسہ یا اسکول نہ تھا جو ان کے مزاج کے مطابق ہو اور جہاں اچھی تعلیم کے ساتھ ساتھ اچھی تربیت کا بھی معقول بندوبست ہو، لہذا آپ کے والد کچھ برسوں کے بعد اپنے تمام اہل و عیال کو لے کر گاؤں سے "بہار شریف" منتقل ہو گئے، اور یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ یہاں آکر انہوں نے آپ کو ایک ہائی اسکول میں داخل کرایا، اور اپنی زیر نگرانی گھر پر بھی تعلیم و تربیت کا سلسلہ جاری رکھا، خاص کر عربی کی جانب زیادہ توجہ دی۔ نتیجۃً مسعود

صاحب بھی پوری لگن اور محنت سے عربی تعلیم کے حصول میں لگ گئے، ان کے والد محترم کی خواہش تھی کہ ان کا بیٹا عالم دین بن کر اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے اپنے آپ کو وقف کردے، اور ملت اسلامیہ کو اس کا بھولا ہوا سبق یاد دلائے۔

مدرسہ عزیزیہ میں داخلہ

مولانا مسعود عالم ندوی نے ابھی میٹرک بھی پاس نہ کیا تھا کہ انہیں ایک مقامی مدرسہ "مدرسہ عزیزیہ" میں داخل کرادیا گیا۔ اب آپ کی تمام توجہ دینی علوم و فنون کی جانب مرکوز ہوگئی۔ اس مدرسے میں آپ نے بڑی محنت اور لگن سے تعلیم حاصل کی، اسی زمانہ میں عربی زبان وادب سے بھی لگاؤ پیدا ہوا۔ چنانچہ آپ عربی رسائل و مجلات کی تلاش میں رہنے لگے۔ اس مدرسہ سے "ملاّ" اور "مولوی" کی سند حاصل کی۔ اس زمانہ میں ملاّ اور مولوی باقاعدہ سند کے نام تھے۔ جیسا کہ آج کل "عالم" یا "فاضل" سند کے نام ہیں۔

اس مدرسہ سے فراغت کے بعد آپ پٹنہ گئے' جہاں آپ نے مدرسہ شمس الہدیٰ میں داخلہ لیا۔ اور تن من دھن سے تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے۔ بالخصوص مدرسہ میں آنے والے عربی رسائل و مجلات کو آپ شوق سے پڑھتے' اور ان کو سمجھنے کی کوشش کرتے یہ وہ زمانہ تھا جب آپ نہایت بے فکری اور اطمینان کے ساتھ حصول تعلیم کے لیے کوشاں تھے۔

زندگی کا ایک اہم حادثہ

اسی درمیان ایک ایسا حادثہ آپ کی زندگی میں پیش آیا، جو آپ کی زندگی کا سخت ترین حادثہ تھا۔ یعنی آپ کی والدہ محترمہ کا سایہ آپ کے سر سے اٹھ گیا۔ اس صدمے کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے تھے۔

"میں سارا سارا دن رویا کرتا اور قرآن خوانی کے سوا کسی دوسری چیز

سے میرا دل نہ بہلا کرتا۔"(۱)

والدہ دمہ کی مریضہ تھیں، اور ان پر دمہ کے خطرناک دورے اکثر پڑتے رہتے تھے، بالآخر یہی مرض جان لیوا ثابت ہوا ورثتہً یہ مرض آپ کو منتقل ہوا جو تاحیات آپ کے ساتھ لگا رہا۔

والدہ کے انتقال کے فوراً بعد ہی سے آپ کو کھانسی کا مرض شروع ہو گیا، اور کھانسی کا دورہ کبھی کبھی اتنی شدت سے آتا تھا کہ حالت دگرگوں ہو جاتی، یہی کھانسی آخر میں دمہ کی شکل اختیار کر گئی۔ اور دمہ ہی نے آپ کی جان لی۔ والدہ کے انتقال کے بعد آپ بہت غمگین رہنے لگے، ہر وقت والدہ کی یاد ستاتی رہتی، گھر کی مالی حالت بھی ٹھیک نہ تھی، دوسری جانب آپ کو تحصیل علم کے لیے کسی اور موزوں جگہ کی تلاش تھی۔ اسی کش مکش میں آپ پٹنہ سے گھر واپس آئے، لیکن گھر پر بھی دل نہ لگا۔ آپ کے خاص رفیق محمد عاصم صاحب ان دنوں کے حالات کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

> "اس کے بعد (والدہ کے انتقال کے بعد) گھر کے حالات بھی کچھ اس طرح کے ہو گئے کہ آپ کو اپنے پاؤں پر آپ کھڑے ہونے کی فکر دامن گیر ہوئی، اسی الجھن میں گھر آئے، اور پھر والدہ صاحبہ کی اطلاع اور اجازت کے بغیر دہلی آکر مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب مرحوم کے مدرسہ میں داخل ہو گئے، وہاں صرف دو ماہ رہے، اور اپنی طبعی نزاکت اور افتادِ طبع کے باعث اپنے آپ کو وہاں کے ماحول سے ہم آہنگ نہ کر سکے، گھر واپس آگئے، لیکن دل تھا کہ گھر رہنے پر رضامند نہ ہوتا تھا، اور کہیں جانے کے لیے چٹکیاں لے رہا تھا، درس نظامی کی اکثر متداول کتابیں اگرچہ پڑھ چکے تھے، لیکن عربی زبان میں لکھنے اور

(۱) ماہنامہ چراغ راہ، مسعود عالم ندوی نمبر ص: ۱۲۹

بولنے پر قدرت نہ تھی، یہ احساس اندر ہی اندر آپ کو پریشان کر رہا تھا، مصر سے آنے والے عربی رسالوں کے مطالعہ نے یہ احساس اور بھی زیادہ شدید کر دیا تھا۔ ایک طرف عربی ادب میں مہارت حاصل کرنے کا یہ ولولہ اور دوسری طرف گھر کے حالات، دن رات کسی موزوں جگہ جانے کے لیے متفکر رہتے، مگر پَرِ پرواز نہ تھا، نہ کوئی مشیر تھا جو کوئی معقول مشورہ دیتا' اور نہ ہی مالی وسائل اس قدر وسیع تھے کہ جہاں چاہتے چلے جاتے۔"(۱)

●●

(۱) ماہنامہ چراغ راہ، مسعود عالم ندوی نمبر ص : ۱۲۸

اعلیٰ تعلیم کے مراحل

علامہ سیّد سلیمان ندوی سے مراسلت

آپ اسی ذہنی کش مکش میں مبتلا تھے کہ مولانا سیّد سلیمان ندوی سے بہار شریف کے اسٹیشن پر ملاقات ہوئی، اس کے بعد آپ نے سیّد صاحب کو خطوط لکھنا شروع کیے، اور ان سے مشورہ طلب کیا کہ کس جگہ عربی زبان و ادب کی تعلیم حاصل کروں، آپ کے خاص رفیق محمد عاصم صاحب لکھتے ہیں:

> ''مسعود صاحب اپنے خطوط میں سیّد صاحب سے مصر کی یونیورسٹیوں اور وہاں کی ادبی و علمی زندگی کے متعلق سوالات کرتے، سیّد صاحب بھی جوہر دیکھ کر مفصّل جواب دیتے، اور انہیں اس چیز پر آمادہ کرنے لگے کہ وہ کسی عربی ملک کا خیال ترک کر کے دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ میں داخل ہو جائیں۔ مسعود صاحب ندوہ آنے کے لیے فوراً تیار ہوگئے لیکن مالی حالت ایسی نہ تھی کہ ندوۃ العلماء کی تعلیم اور رہائش کے تمام مصارف خود برداشت کر سکتے، اس لیے سیّد صاحب نے ماہانہ وظیفہ کا بھی انتظام کرا دیا(۱)"

سید صاحب کے مشورے پر آپ ندوۃ العلماء آنے کے لیے تیار ہوگئے وہ خط جس میں سیّد صاحب نے ان کو ندوۃ العلماء آنے کا مشورہ دیا تھا، عربی میں ہے، واقعہ یہ تھا کہ

(۱) ماہنامہ چراغ راہ، مسعود عالم ندوی نمبر ص: ۱۲۸

مولانا مسعود عالم ندوی نے بھی سیّد صاحب کو عربی زبان ہی میں خط لکھا تھا، ابتداء میں جوش و جذبہ ہر طالب علم میں ہوتا ہی ہے، چناں چہ یہ خط مکاتیب سلیمان کا پہلا خط ہے۔ اس خط کا ترجمہ جو مسعود صاحب ہی کا کیا ہوا ہے یہاں درج کیا جاتا ہے:

دیسنہ ۷/رمضان المبارک ۱۳۴۶ھ

برادر عزیز

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

اس سے پہلے آپ کا ایک خط اور ملا تھا، اور مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے اس کا جواب بھی دے دیا تھا، کل آپ کا دوسرا خط ملا۔ جواباً عرض ہے۔ یہ بڑی خوشی کی بات ہے اور اس پر مبارک باد قبول کیجئے کہ آپ کو طلب علم کا بے حد شوق ہے، اور اس کے لیے آپ دوسری جگہ جانے کے لیے تیار ہیں، آپ کے دونوں عربی خطوط سے میں نے یہ سمجھا ہے کہ آپ کا عربی کی طرف کافی رجحان ہے، اور آپ کو اس زبان سے کافی دل چسپی ہے، اگر آپ کوشش کر کے کسی اچھے ادیب کی صحبت حاصل کرلیں تو آپ کو بڑی نمایاں کامیابی حاصل ہو سکتی ہے، اگر آج آپ کی غلطیاں بہت ہیں، تو انشاء اللہ کل آپ کی تحریر میں صحت کا غلبہ ہوگا۔

مصر میں اس وقت تین یونیورسٹیاں ہیں۔ ان میں سب سے پرانی اور مشہور جامع ازہر ہے۔ لیکن اس کا طریقہ اور طرز تعلیم نہایت پرانا ہے، اور ہمارے یہاں کے مدرسہ دیوبند کی طرح یہ بھی اپنے شیوخ و اسلاف کے بتائے ہوئے طریقے پر پوری طرح جامد ہے۔

دوسری تعلیم گاہ جامعہ مصریہ ہے، یہ ہندوستان کی مسلم یونیورسٹی

علی گڑھ یا دوسری انگریزی یونیورسٹیوں کی طرح بالکل غیر دینی اور نئے طرز کی درس گاہ ہے، اور اس میں کوئی طالب علم اپنی مقامی حکومت کی اجازت کے بغیر داخل نہیں ہو سکتا۔

تیسری درسگاہ کا نام دارالعلوم ہے، اس کی حیثیت ہندوستان کے انگریزی کالجوں کی ہے، اس میں بھی کوئی باہر کا طالب علم اپنی مقامی حکومت کی اجازت کے بغیر داخل نہیں ہو سکتا۔ ہر طالب علم کا سالانہ خرچ تیس پونڈ ہوتا ہے، پندرہ پونڈ کھانے پینے اور رہائش کے لیے اور پندرہ فیس اور مدرسے کے دوسرے مصارف کے لیے، جیسے کتابوں کاپیوں اور لکھنے پڑھنے کی دوسری چیزوں کی قیمت۔ آپ کو میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ ایک یا دو سال کے لیے ندوۃ العلماء کے مدرسے میں داخل ہو جائیں۔"

سلیمان ندوی(۱)

ندوۃ العلماء میں داخلہ

سیّد سلیمان ندوی کی تحریک پر ہی آپ نے ندوۃ العلماء آنے کا مصمّم ارادہ کر لیا سیّد صاحب آپ کے تمام خطوط کا مفصّل جواب دیتے، جن میں عربی ادباء کا تذکرہ اور عربی زبان و ادب کے شہ پارے ہوتے۔ اس طرح سے سیّد صاحب کے ساتھ آپ کا تعلق ندوۃ العلماء آنے سے پہلے ہی قائم ہو گیا تھا اور سیّد صاحب نے بھی آپ کی خداداد صلاحیتوں کو دیکھ کر ایک طرح سے آپ کی تربیت ندوۃ العلماء آنے سے پہلے ہی شروع کر دی تھی۔ اسی وجہ سے سیّد صاحب نے جیسے ہی آپ کو ندوۃ العلماء آنے کا مشورہ دیا، آپ فوراً تیار ہو گئے۔ جولائی ۱۹۲۸ء کو لکھنؤ پہنچے اور ندوۃ العلماء کی علمی و ادبی سرزمین پر قدم رکھا۔ سال آخر میں

---

(۱) مکاتیب سلیمان ص:۱۰

آپ کا داخلہ ہو گیا، آپ نے اپنی غیر معمولی ذہانت، محنت اور علمی ذوق کی بدولت امتیازی نمبروں سے سالانہ امتحان پاس کر لیا۔

مولانا ناظم ندوی مدرسہ عزیزیہ بہار میں مولانا مسعود عالم ندوی کے اچھے ساتھی تھے، ندوۃ العلماء میں بھی دونوں کے تعلقات برابر قائم رہے، آپ رقم طراز ہیں۔

"دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے علمی ماحول میں انہیں اپنے ذوق کی تکمیل کا پورا موقع ملا۔ اس کے عظیم الشان کتب خانہ میں ہر علم و فن پر اعلیٰ درجہ کی ہزاروں کتابیں موجود ہیں، دارالعلوم میں داخل ہوئے ابھی چند ماہ بھی نہیں گزرنے پائے تھے کہ اپنی خداداد صلاحیت و ذہانت، غیر معمولی علمی ذوق اور مطالعہ کی بدولت ان کا شمار ممتاز طلبہ میں ہونے لگا تھا، انہیں انجمن "الاصلاح" کی کتابوں کے مطالعہ کا الگ موقع ملا، انجمن الاصلاح کو طلباء دارالعلوم کے افکار و خیالات اور ان میں ادبی ذوق پیدا کرنے میں بڑا دخل رہا ہے۔ اس میں مختلف علوم و فنون پر اردو زبان میں بڑا بیش بہا سرمایہ ہے، یہاں ہندوستان کے مشہور مصنفین کی تقریباً تمام تصنیفات، عربی اور اردو کے مشہور اخبارات کی فائلیں بھی موجود ہیں، تاریخ، ادب اردو، ادب عربی اور صحافت سے انہیں ابتداء ہی سے دلچسپی تھی، ان کے مطالعہ کی رفتار بہت تیز تھی۔ انہوں نے بہت جلد انجمن "الاصلاح" کو کھنگال ڈالا اور اس کا مغز ہضم کر لیا، انجمن "الاصلاح" کی بدولت اچھے اچھے اہل قلم، ادیب اور افسانہ نگار پیدا ہوئے، ان میں مسعود عالم صاحب کا پایہ بہت بلند ہے۔"(۱)

(۱) ماہنامہ چراغ راہ، مسعود عالم ندوی نمبر ص : ۲۴

عربی ادب کی تکمیل

مولانا مسعود عالم ندوی نے ۱۹۲۹ء میں دار العلوم ندوۃ العلما سے آخری درجے کا امتحان دے کر نہایت ممتاز کامیابی حاصل کی، لیکن ان کا دل مطمئن نہ تھا، عربی زبان و ادب میں اپنے آپ کو طفل مکتب ہی سمجھتے تھے۔ لہذا عربی ادب کی تکمیل کی خاطر مزید دو سال ندوۃ العلماء میں رہنے کا عزم کر لیا، ان دو برسوں میں آپ نے دن رات ایک کر کے عربی ادب کے خزانے کو کھنگال ڈالا، عربی رسائل و مجلّات کا خوب مطالعہ کرتے، آپ کا کمرہ عربی ادب کا ذوق رکھنے والے طلباء سے بھرا رہتا، مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں:

”وہ (مسعود صاحب) عربی ادب و انشاء میں شروع ہی سے ممتاز تھے۔ زمانہ طالب علمی میں بھی وہ اپنا روزنامچہ عربی میں لکھتے تھے، ان کا یہ عربی ذوق سب کو معلوم تھا اور جو لوگ ان کے ذوق میں کسی طرح کے شریک تھے، ان کا وہ مرکز اور سر حلقہ تھے، راقم سطور کو بھی اپنے عرب اساتذہ کی صحبت اور فیض درس سے اس کا چسکا تھا، اور میں بھی عربی میں لکھتا پڑھتا رہتا تھا، اس وقت میرا تعارف ندوی حلقہ میں سابق ناظم ندوۃ العلماء مولانا حکیم سیّد عبدالحی کے فرزند اور اس وقت کے ناظم ندوۃ العلماء ڈاکٹر سیّد عبدالعلی کے چھوٹے بھائی اور ایک ایسے طالب علم کی حیثیت سے تھا، جس کو اپنی نوعمری کے باوجود عربی ادب و انشاء سے شغف تھا، اس وقت مسعود صاحب شبلی دارالاقامہ میں مقیم تھے، مولانا شبلی مرحوم فقیہ دارالعلوم کے پاس میرا ایک فقہ کا سبق تھا، اور مسعود صاحب کا کمرہ راستے میں پڑتا تھا، ایک آدھ بار گزرتے ہوئے مسعود صاحب نے مجھے اندر آنے اور کچھ دیر بیٹھنے کی دعوت دی تھی، میرے لیے دل چسپی کا ایک سامان یہ تھا

کہ عربی رسائل و مجلّات جو طلباء کے دار المطالعہ میں آتے تھے، وہ دن میں اکثر مسعود عالم صاحب کے پاس رہتے۔ دمشق کے مشہور علمی و ادبی رسالے "المجمع العلمی" کے دیکھنے کا سب سے پہلے وہیں اتفاق ہوا۔"(۱)

ندوۃ العلماء میں عربی ادب کی تکمیل کے لیے ایک تحقیقی مقالے کا لکھنا ضروری ہوتا ہے، جس کی بنیاد پر عربی ادب کی سند دی جاتی ہے۔ مسعود صاحب نے ایک مبسوط اور پر مغز مقالہ "تاثیر الاسلام فی الشعر العربی" کے عنوان سے لکھا، مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی اس تحقیقی مقالے کے بارے میں رقم طراز ہیں:

"اس مضمون میں انہوں نے مورخینِ ادب کے اس مشہور دعوے کو چیلنج کیا تھا کہ اسلامی تاثرات سے عربی شاعری کے زور، روانی اور مضامین کی آمد میں فرق پڑ گیا تھا، اسلامی عقائد و آداب اور اس کی تہذیب و تربیت اور ماحول نے اس کو پابند و بے روح بنا دیا تھا، اس سلسلے میں انہوں نے اسلامی دور کے شعراء کا کلام اپنے ثبوت میں پیش کیا تھا۔ اور اس تفصیل سے اس پر بحث کی تھی کہ اسلام نے زندگی کے اور شعبوں کی طرح ادب و شاعری کو بھی بہت کچھ عطا کیا۔"(۲)

آپ کا یہ مقالہ عربی ادب کی تکمیل کے لیے منظور کر لیا گیا، اور آپ کو ندوۃ العلماء نے ادب عربی کی سند سے سرفراز کیا۔

میٹرک اور ایف۔ اے کا امتحان

ادب عربی کی تکمیل کے بعد آپ اپنے گھر بہار شریف تشریف لے گئے، اور

---

(۱) پرانے چراغ ص : ۳۱۸

(۲) ایضاً ص : ۳۲۰

انگریزی پڑھنے میں مشغول ہو گئے، میٹرک کا امتحان اچھے نمبروں سے پاس کر کے ایف، اے کے امتحان کی تیاری شروع کر دی، اس طرح سے آپ کو انگریزی کتب کے مطالعے کا بھی موقع ملا۔

چنانچہ مولانا ناظم ندوی لکھتے ہیں:

"جس زمانے میں وہ ایف، اے کی تیاری کر رہے تھے، استاذ مکرّم ماسٹر عبدالسمیع صاحب استاد دارالعلوم ندوۃ العلماء کہا کرتے تھے، مسعود صاحب کی انگریزی بی۔اے کے برابر اور ان کے مضامین کا معیار بی۔اے کے اعلیٰ استعداد کے طالب علم کے برابر ہے۔"(۱)

ماسٹر عبدالسمیع صاحب مرحوم ایک طویل عرصے تک دارالعلوم میں انگریزی کے استاذ رہے ہیں، مجھے بھی ان سے پڑھنے کا موقع ملا ہے، آپ انگریزی میں شاعری بھی کرتے تھے، اکثر لڑکوں سے ان کو شکایت رہتی تھی کہ لڑکے انگریزی دل چسپی سے نہیں پڑھتے ہیں، اسی وجہ سے کسی بھی طالب علم کی انگریزی سے مطمئن نہ تھے، لیکن مسعود صاحب کے بارے میں ان کا مذکورہ قول ایک طرح سے بہت بڑا اعزاز ہے۔

●●

---

(۱) ماہنامہ چراغ راہ، مسعود عالم ندوی نمبر ص

ندوۃ العلماء اور مسعود عالم ندوی

شیخ تقی الدین ہلالی کی ندوہ آمد

اسی زمانے میں جب مولانا مسعود عالم ندوی ایف۔ اے کی تیاری میں مصروف تھے، ایک ایسا موقع پیش آیا، جس نے آپ کی زندگی پر گہرا اثر ڈالا۔ حجاز مقدّس سے شیخ تقی الدین الہلالی سیّد سلیمان ندوی کی ایماء پر ندوۃ العلماء میں عربی ادب کے استاذ ہو کر آئے، آپ عربی ادب کے ممتاز ادیب اور صرف و نحو میں سند کا درجہ رکھتے تھے، عربی زبان و ادب پر آپ کی خاص نظر تھی۔

مولانا مسعود عالم ندوی اگرچہ دار العلوم ندوۃ العلماء سے فارغ ہو چکے تھے اور وہاں کی اعلیٰ سند بھی حاصل کر چکے تھے، صاحب کلام اور عربی زبان و ادب کے ادیب ہو چکے تھے، لیکن آپ ہمیشہ اپنے آپ کو ایک طالب علم سمجھتے رہے، چنانچہ دار العلوم ندوۃ العلماء واپس آنے کے لیے بے تاب رہنے لگے، چند ماہ کے بعد آپ ایف۔اے کا امتحان دینے والے تھے کہ اچانک آپ کی سوچ میں کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم کے سلسلے میں تبدیلی کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ شاید شیخ تقی الدین الہلالی کی ندوۃ آنے کی خبر نے آپ کو کالج و یونیورسٹی کی تعلیم سے دور کر دیا۔ چناں چہ مولانا ناظم ندوی لکھتے ہیں:

> ”وہ (مسعود صاحب) چند ماہ کے بعد ایف۔اے کا امتحان دینے والے تھے اور تیاری مکمل کر لی تھی کہ اچانک ان کے ذہنی نقشے میں تبدیلی ہونے

لگی۔اور کالج و یونیورسٹی کی اسناد کے متعلق ان کی رائے بدلنے لگی۔ انہیں اپنے لیے یہ اسناد بے کار معلوم ہونے لگیں، چنانچہ وہ چند ہفتے تک ایف۔اے کا امتحان دینے اور نہ دینے کے بارے میں تذبذب میں رہے، ایک دن انہوں نے معروف طریقے پر دعاء استخارہ کی، ان کا تذبذب دور ہو گیا، اور کالج کی سند حاصل کرنے کا ارادہ ترک کر دیا لیکن انگریزی کتابوں، رسالوں اور اخبارات کا وہ باضابطہ مطالعہ کرتے رہے، انہوں نے متعدد بار کہا کہ استخارہ کے بعد الحمد للہ مجھے کامل اطمینان و سکون حاصل ہو گیا ہے۔اب اس معاملے میں کوئی خلش و تذبذب نہیں ہے، میں نے جو راہ اختیار کی ہے وہ سوچ سمجھ کر اطمینانِ قلب کے ساتھ اختیار کی ہے۔"(۱)

ندوۃ العلماء میں بحیثیت استاد اور مدیر "الضیاء"

اسی درمیان یعنی ۱۹۳۲ء کے بالکل شروع میں مولانا سیّد سلیمان ندوی اور شیخ تقی الدین ہلالی نے دار العلوم ندوۃ العلماء سے ایک عربی ماہنامہ جاری کرنے کا فیصلہ کیا، اس کی ادارت کے لیے مولانا مسعود عالم صاحب ندوی کا نام بالاتفاق منظور کر لیا گیا، مسعود صاحب کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو خوشی سے پھولے نہ سمائے۔ مولانا سیّد ابو الحسن علی ندوی اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

"اس زمانے کا ایک اہم واقعہ جس نے ہم سب کی زندگی پر خاص اثر ڈالا، یہ تھا کہ شیخ تقی الدین الہلالی المراکشی ہمارے دار العلوم میں استاذ ادب ہو کر آئے، موصوف عالمِ عربی کے ممتاز ترین محقق و ادیب اور صرف و نحو میں سند و حجت کا درجہ رکھتے تھے، ان کی بول چال اور عام تحریر کی زبان پوری عربی دنیا میں اپنی صحت، سلاست، برجستگی اور عربی محاورات میں بے نظیر

---

(۱) ماہنامہ چراغ راہ مسعود عالم ندوی نمبر ص ۱۴۰

ہے۔ اس طرح شیخ کے آنے سے دارالعلوم میں ایک نئی ادبی زندگی اور چہل پہل پیدا ہوگئی۔ مسعود عالم صاحب ندوی اگرچہ دارالعلوم سے فارغ ہوگئے تھے۔ اور صاحب قلم ادیب تھے، لیکن شیخ کی ملاقات کے بعد انہوں نے اندازہ کرلیا کہ ان کی طالبِ علمانہ زندگی کا اختتام نہیں، بلکہ اس کا ایک نیا دور شروع ہو رہا ہے۔ یوں ہم سب شیخ کے تلامذۂ خاص اور مریدان بااختصاص تھے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کی ذات سے سب سے زیادہ مسعود صاحب نے فائدہ اٹھایا اور پھر اس فائدے کو اپنے قلم واخلاص سے چمکایا۔ غالباً ۱۹۳۲ء میں مولانا سید سلیمان ندوی اور ہلالی صاحب نے دارالعلوم سے ایک عربی رسالے کے اجراء کا فیصلہ کیا، اور اس کی ادارت کے لیے قرعہ فال قدرتی طور پر مسعود عالم ندوی صاحب کے نام پڑا۔ ان سے زیادہ نہ صرف ہمارے حلقہ میں بلکہ سارے ہندوستان میں اس کام کے لیے اور کون موزوں تھا۔"(۱)

اطلاع ملتے ہی مولانا مسعود عالم ندوی فوراً ندوہ پہنچ گئے اور ہلالی صاحب کی صحبت سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے لگے۔ محرّم الحرام ۱۳۵۱ھ مئی ۱۹۳۲ء میں عربی رسالہ "الضیاء" کا اجراء عمل میں آیا، جو ماہنامہ تھا۔ رسالہ کا دائرہ اگرچہ محدود تھا، لیکن زبان کی صحت اور مضامین کی بلندی کے لحاظ سے عرب ممالک میں بے حد مقبول ہوا، "الضیاء" کل چار سال جاری رہا، شروع کے دو سال مسعود صاحب اس کے ایڈیٹر، ہلالی صاحب اور سید سلیمان ندوی مرحوم اس کے سرپرست رہے، لیکن ۱۹۳۴ء میں ہلالی صاحب استعفا دے کر عراق چلے گئے۔ مولانا مسعود عالم ندوی پر یہ جدائی بہت شاق گزری۔ انہیں اپنے استاد سے بڑی محبت تھی، لہذا انہوں نے عراق جا کر ان کی صحبت میں کچھ سال گزارنے کا ارادہ کیا،

---

(۱) پرانے چراغ ص ۱۲۲

بغداد، دمشق، فلسطین اور مصر وغیرہ کی سیاحت اور وہاں کے علماء و ادباء سے استفادہ کرنے کا بھی ارادہ تھا۔ دارالعلوم کے کارکنوں نے اس شرط پر عراق جانے کی اجازت دے دی کہ ان کی غیر حاضری میں "الضیاء" پابندی سے جاری رکھنے کا انتظام کر دیا جائے، چنانچہ آپ نے مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی کو اس بات پر رضامند کر لیا کہ ان کے بعد وہ "الضیاء" کی ادارت کرتے رہیں گے۔ جیسا کہ ایک خط میں مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی کو لکھتے ہیں، جو ۱۷/محرّم الحرام ۱۳۵۳ھ کا ہے:

"ہلالی صاحب زبیر (عراق) میں قیام پذیر ہیں، میرا ارادہ ہو رہا ہے کہ ایک سال کے لیے ہو آؤں، ڈاکٹر صاحب راضی ہیں اور پوری تائید کے ساتھ، مسعود صاحب (۱) پہلے متامل تھے، مگر رات راضی معلوم ہو رہے تھے، مگر ان کا پہلا مطالبہ یہ ہے کہ علی میاں کو بلا کر "الضیاء" سپرد کر دو، اس کے بعد رخ کر سکتے ہو، سیّد صاحب کو خط لکھا ہے اب صرف ان کے جواب کا انتظار ہے۔ اگر حسب توقع انہوں نے اجازت دے دی، تو میرا سفر صرف آپ کے اختیار میں رہے گا، ادارت و ترتیب کا آپ ذمہ لیں دوڑ دھوپ کا کام کوئی اور صاحب کریں گے۔"(۲)

ایک اور خط میں جو ۱۴/محرّم الحرام ۱۳۵۳ھ کا ہے، لکھتے ہیں کہ مقصود سفر کیا ہے کیا کہا جائے، آپ میرے خیالات اور ارادوں سے بخوبی واقف ہیں۔

پہلے ہلالی صاحب کے پاس "زبیر" حاضر ہوں گا۔ اور وہیں قیام کروں گا۔ اگر حالات و مصارف نے اجازت دی تو بغداد، عراق اور فلسطین تک کا ارادہ ہے مگر ابھی خواب

---

(۱) مولانا مسعود علی ندوی ناظم دارالمصنفین اعظم گڑھ ورکن انتظامیہ ندوۃ العلماء، لکھنؤ

(۲) پرانے چراغ ص: ۳۲۲

ہی خواب ہے۔"(۲)

لیکن اس خواب کی تعبیر یہ نکلی کہ حکومت نے خفیہ رپورٹ کی بناء پر پاسپورٹ دینے سے منع کر دیا۔ اور اس طرح مسعود صاحب عراق نہ جا سکے، بلکہ ہلالی صاحب کی عدم موجودگی میں "الضیاء" کا سارا بار اب آپ ہی کے کندھوں پر آن پڑا، اور آپ نے پوری محنت اور لگن کے ساتھ "الضیاء" کو برابر جاری رکھا۔ اسے نکلے ہوئے ابھی چار سال ہی ہوئے تھے کہ سیّد سلیمان ندوی سخت بیمار پڑ گئے۔ اشاعت پہلے ہی سے کم تھی، سیّد سلیمان ندوی امداد حاصل کرتے رہتے تھے لیکن ان کی بیماری کے بعد یہ امداد بھی بہت کم ہو گئی، دوسرے منتظمین تو پہلے ہی اس رسالے کو دیکھ دیکھ کر جل رہے تھے، اور دن رات اسے ختم کرنے کی فکر میں رہتے تھے۔ سیّد صاحب کی علالت کو ان لوگوں نے غنیمت جانا، چنانچہ چار سال تک ہندوستان کا یہ واحد عربی رسالہ جو عربی دنیا کے لیے ہندوستانی مسلمانوں کا بہترین ترجمان تھا، جاری رہنے کے بعد ختم ہو گیا۔ اس کے بعد اگرچہ مسعود صاحب نے بعض ندوی حضرات کی مدد سے "الضیاء" کو بطور خود جاری رکھنا چاہا، مگر کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ وہ ندوۃ العلماء میں تاریخ و ادب کے ایک مدرس ہو کر رہ گئے۔

طلباءِ ندوہ کی اسٹرائک میں آپ کا رول

مولانا مسعود عالم ندوی ندوۃ العلماء میں اعتدال، مذہبی رواداری اور تعلیم کے طریقوں میں تمام مفید ذرائع سے کام لینے کے پرزور حامی تھے۔ اور ساتھ ہی ساتھ انگریزی پڑھنے کو بھی طلباء کے لیے ضروری سمجھتے تھے، اور انگریزی مضمون کی جانب طلباء کی توجہ مبذول کراتے رہتے تھے لیکن ادھر چند برسوں سے ندوۃ العلماء کے نظم و نسق اور داخلی سیاست میں کچھ ایسے حضرات پیش پیش تھے جو ندوۃ العلماء کو اپنے اصولوں سے ہٹا کر خالص مذہبی مدرسہ بنانے کی کوشش کر رہے تھے، اور اس سلسلے میں وہ من مانی کارروائیاں بھی

---

(۱) پرانے چراغ ص: ۳۲۳

کرنے لگے تھے۔

اس رجحان کو مدرسین اور طلبہ میں سے کچھ لوگ محسوس کر رہے تھے، جس کا نتیجہ ستمبر ۳۵ء میں ایک اسٹرائک کی شکل میں ظاہر ہوا۔ اس اسٹرائک کا اثر اگرچہ کسی نہ کسی حد تک ہوا، مگر اسٹرائک پوری طرح کامیاب نہ ہو سکی، تین طالب علم اور ایک مدرس کو دارالعلوم سے خارج کر دیا گیا، مسعود صاحب کو اگرچہ خارج نہ کیا گیا لیکن ندوۃ العلماء کے احاطے سے باہر رہنے کا حکم ہوا، اس سلسلے میں سیّد سلیمان ندوی آپ کے ایک خط کے جواب میں لکھتے ہیں۔

"آپ کا خط ملا، حالات بھی معلوم ہوتے رہے، میں اس صورتحال پر اِنّا لِلّٰہِ کے سوا اور کیا پڑھ سکتا ہوں، ندوۃ العلماء کی بدقسمتی کا یہ مسلسل تجربہ ہے کہ جب حالت ذرا سدھرنے لگی اس کو ایک ایسا دھچکا لگا کہ پرانی کوششیں سب رائیگاں گئیں، انہیں مسلسل دھچکوں میں سے ایک یہ بھی ہے، جو تمام ترغیر متوقّع ہے، دارالعلوم اب گویا سارا ندویوں کے ہاتھ میں ہے، اس پر بھی باہم خلفشار اور اختلاف بصورت مخالفت ہو، تو پھر اس کا اللہ مالک ہے۔ کام چلنے کی تدبیر صرف ایک ہے، قوتِ عمل تمام شرکائے عمل میں نہیں ہوتی۔ جس ایک میں ہو، اس کا ساتھ دے کر بقیہ شرکاء اس کے ساتھ چلیں، جہاں بھی کام ہوگا، اسی اصول پر ہوگا۔ فتنوں اور ہنگاموں سے نہ ہوگا۔"

اس خط پر مسعود صاحب کا یہ نوٹ بھی ساتھ ہی لگا ہوا ہے۔

"یہ طویل مکتوب دارالعلوم ندوۃ العلماء کے اندرونی حالات کے متعلق ہے، ستمبر ۳۵ء کے آغاز میں طلبہ اور مولوی عبدالسلام صاحب قدوائی ندوی نگراں دارالاقامہ کے درمیان کچھ اختلاف رُونما ہوا، تین طالبِ

علم، سیّد حسن مثنی، ضیاء اللہ فاروقی جون پوری، عبداللطیف اعظمی خارج کیے گئے۔ ایک طوفان برپا ہوا، جس کی لپیٹ میں تین مدرس (مسعود عالم، مفتی محمد سعید، ابواللیث) بھی آگئے، ان میں راقم پیش پیش تھا۔ ادھر عبدالسلام صاحب کی حمایت میں ایک ایسی شخصیت آگئی، جو ندوہ کی سیاسیات میں دخیل اور اسے خراب کر رہی تھی۔ طلبہ تو خیر لے لیے گئے، لیکن ان کے حامی مدرسین معتوب ہوئے، نزلہ بر عضو ضعیف ابواللیث صاحب الگ کر دیے گئے۔ مسعود عالم اور مفتی سعید کو ندوۃ العلماء کے احاطے سے باہر رہنے کا حکم ہوا، سیّد صاحب قبلہ کے مخبر اور معلومات بہم پہنچانے والے ہماری پوزیشن کے متعلق صحیح اطلاع نہیں دیتے تھے، ہماری طبیعت خوشامد اور چاپلوسی سے ہمیشہ متنفر اور بے نیاز رہی۔ والحمد للہ۔"(۱)

ندوۃ العلماء سے بجنور منتقلی اور واپسی

ندوۃ العلماء کے اندرونی حالات کی وجہ سے مسعود صاحب ندوہ کی زندگی سے تنگ آچکے تھے۔ اب نہ تو "الضیاء" نکلتا تھا اور نہ ہی کسی دوسری علمی سرگرمی سے ان کا واسطہ تھا، وہ ندوہ میں صرف ادب عربی کے ایک استاد ہو کر رہ گئے تھے، وہ بھی صرف درس کے اوقات میں ندوہ آتے تھے باقی وقت ندوہ کے احاطے سے باہر ہی گزارتے، تقریباً دو سال تک یہ سلسلہ جاری رہا، اور ارباب ندوہ کا عتاب بھی برابر قائم رہا، چنانچہ آپ سخت ذہنی اذیت میں مبتلا تھے، اور ندوہ میں آپ کا دل نہ لگتا تھا، آپ ندوہ سے قطع تعلق کرنا چاہتے تھے، چنانچہ جون ۳۷ء میں موقع ملا اور تین ماہ کی رخصت لے کر بجنور چلے گئے، اور وہاں اخبار "مدینہ" کے اسٹاف میں شامل ہوگئے۔ مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی اس سلسلے میں رقم طراز ہیں:

---

(۱) مکاتیب سلیمان ص : ۶۴

"۱۳۵۶ھ ۷ ۱۹۳ء میں دارالعلوم میں کچھ ایسے حالات پیدا ہوئے کہ مسعود صاحب وہاں کے قیام سے کچھ غیر مطمئن ہوگئے اسی زمانہ میں "مدینہ" بجنور کی طرف سے ایک پیش کش ہوئی اور مسعود صاحب شریک ادارت ہو کر بجنور چلے گئے اور انہوں نے اپنے فرائض خوش اسلوبی اور لیاقت سے انجام دیے، عالم اسلام کی واقفیت اور بالخصوص ممالک عربیہ کے حالات میں وہ سند (Authority) کا درجہ رکھتے تھے، وہ ہمیشہ سے شستہ اور شگفتہ اردو لکھتے تھے اور کامیاب صحافی بن سکتے تھے، ان کے بہت سے دوستوں نے ان کی اس نئی ذمہ داری کو پسند کیا، قارئین مدینہ نے بھی ان کے ادارتی شذرات و مضامین پر پسندیدگی کا اظہار کیا، لیکن خود ان پر دارالعلوم ندوۃ العلماء کی جدائی شاق تھی اور خالص صحافتی زندگی ان کی افتاد طبع اور علمی مذاق کے خلاف تھی۔"(۱)

مسعود صاحب نے یہ اقدام مولانا سیّد سلیمان ندوی کی اطلاع اور اجازت کے بغیر کیا۔ حالانکہ اب تک انہوں نے اپنی زندگی میں سیّد صاحب کے مشورے کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھایا تھا، اس سے بھی اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان دنوں وہ کس قدر ذہنی اذیت میں مبتلا رہ کر ندوۃ العلماء میں اپنے شب وروز گزار رہے تھے۔ سیّد صاحب کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو انہیں سخت تکلیف پہنچی، چنانچہ ایک خط میں مسعود صاحب کو لکھتے ہیں:

"آپ کے اخیر خط سے پہلے آپ کی موجودہ صورت حال معلوم نہ تھی، مجھے خیال نہ تھا کہ میرے مشورے کے بغیر ایسا اہم اقدام کریں گے، شاید بحالت اضطراب آپ نے ایسا کیا ہے اور جب آپ ایسا کر چکے ہیں تو پھر آپ کو واپسی کا مشورہ دینا بڑی ذمہ داری کا کام ہے۔"

اس خط پر مسعود صاحب کا حاشیہ یوں ہے:

---

(۱) پرانے چراغ ص ۳۳۰

"دو برس پہلے ارباب ندوہ کا معتوب ہونے کے بعد راقم وہاں سے نکل بھاگنا چاہتا تھا جون ۳۷ء میں اس کا موقع ملا اور اخبار "مدینہ" بجنور کے اسٹاف میں شامل ہو گیا، گزشتہ دس سالوں (۲۸ء۔۳۷ء) میں یہ پہلا اقدام تھا، جو عاجز نے مکتوب نگار کے مشورے کے بغیر کیا۔ وجہ یہ تھی کہ ان کے صدمے کی گھڑی میں ذاتی مسائل کا بار نہیں دینا چاہتا تھا، ندوہ سے بیزاری کی وجہ دراصل ارباب اقتدار کا عتاب تھا۔ اور وہ اچھوت کی زندگی تھی جو بعض دوسرے احباب کی طرح میں بھی دو سال سے بسر کر رہا تھا، لیکن حضرت الاستاذ کو ان گندگیوں کی بار بار خبر دے کر پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا۔"(۱)

مسعود صاحب ندوۃ العلماء کی اچھوت سی زندگی سے تنگ آکر جانے کو تو بجنور چلے گئے، لیکن ان کا دل مطمئن نہ تھا، کیوں کہ ندوۃ العلماء کی محبت ان کے رگ رگ میں پیوست ہو چکی تھی۔

۶/جمادی الاولیٰ ۱۳۵۶ھ کو ایک خط کے جواب میں مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی کو لکھتے ہیں:

"میں یہاں آیا حالات سے مجبور ہو کر، لیکن معلوم ہوا کہ عربی ختم ہو جائے گی، دو ہی ہفتوں کے بعد ارادہ متزلزل ہو گیا، اتنے میں فاران بند ہونے لگا، شیر محمد صاحب (۲) کو ایک جگہ مطلوب تھی، سیّد صاحب مدّظلہ کا گرامی نامہ آیا کہ تم ندوہ چلے آؤ، کوئی صورت نکالی جائے گی، اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ، فوراً تیار ہو گیا۔ شیر محمد صاحب بھی خوش ہوئے، مالک اخبار کو

---

(۱) مکاتیب سلیمان ص

(۲) مولانا ابواللیث ندوی مرحوم جو اس وقت فاران کے اڈیٹر تھے اور ان کا اصل نام شیر محمد ہی تھا۔

کچھ رنج ہوا، ڈاکٹر صاحب مد مجدہ نے بھی اپنی عنایت سے مسرت کا اظہار کیا ہے۔ اب اس ناچیز کو اور کیا چاہیے، میرے پاس اسی دوران میں متعدد خطوط آئے، مدینہ ہر جگہ جاتا ہے، تمام ملنے والوں نے اپنی بری بھلی رائے دی، لیکن اب تک اس کا خط نہیں آیا تھا جس کی محبت میرے دل میں جاگزیں ہے، محبت نہیں بلکہ احترام (۱) سچ کہتا ہوں کچھ تکلیف محسوس کر رہا تھا، معلوم نہ تھا کہ آپ کہاں ہیں ورنہ خود لکھتا، آخر آج صبح نوید بشارت ملی، اور دل کا ایک بوجھ دور ہو گیا، میں اس کا تصوّر نہیں کر سکتا تھا کہ آپ دارالعلوم سے الگ ہوں، اور نہ ہی اپنے لیے پہلے تصور کر سکتا تھا، لیکن حالات سے مجبور ہو گیا، پھر کشش لے جا رہی ہے، سیّد صاحب کا فرمان ایک بہانہ بن گیا ہے، آپ سے دل کی بات کہہ دی، ورنہ لوگوں کو یہی لکھا ہے کہ سیّد صاحب کی حسب ہدایت جانا پڑ رہا ہے۔" (۲)

اگرچہ اس خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسعود صاحب ندوۃ العلماء آنے کے لیے بے تاب تھے، اور سیّد سلیمان ندوی نے جیسے ہی ندوہ آنے کا مشورہ دیا، فوراً تیار ہو گئے، لیکن سیّد صاحب کے خط پر مسعود صاحب نے جو حاشیہ لکھا ہے کہ "ندوۃ العلماء سے بےزاری کی وجہ دراصل ارباب اقتدار کا عتاب تھا، اور وہ اچھوت کی زندگی تھی جو بعض دوسرے احباب کی طرح میں بھی بسر کر رہا تھا لیکن حضرت الاستاذ کو ان گندگیوں کی بار بار خبر دے کر پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا۔" (۳)

اس سے اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ آپ ندوۃ العلماء کی زندگی اور وہاں کے شب

---

(۱) مراد مولانا ابوالحسن علی ندوی ہیں۔

(۲) پرانے چراغ ص ۳۳۱

(۳) مکاتیب سلیمان ص:

وروز سے تنگ آکر ہی مجبوراً بجنور گئے تھے، اور ندوۃ العلماء واپس آنا نہیں چاہتے تھے، اس لیے کہ ارباب اقتدار اب بھی وہی تھے، جو ان کے ندوہ چھوڑنے کے وقت تھے۔ مسعود صاحب کے رفیق خاص محمد عاصم صاحب لکھتے ہیں: ''وہ (مسعود عالم ندوی) کسی طرح ندوہ واپس آنے پر تیار نہ تھے، لیکن جب سیّد صاحب نے بہت اصرار کیا تو اس شرط پر واپس آگئے کہ سیّد صاحب ناظم دارالعلوم کو از خود یہ لکھیں کہ مسعود صاحب میرے حکم سے ندوہ واپس آرہے ہیں۔''(۱)

خیال یہ ہے کہ مسعود عالم صاحب سے اہل ندوہ اگرچہ اچھوت کا سا سلوک کر رہے تھے، اور مجبوراً وہ بجنور جاکر ''مدینہ'' کے اسٹاف میں شامل ہوگئے تھے، لیکن ان کے دل میں ندوۃ العلماء کی محبت حد سے زیادہ تھی اس لیے وہ ندوۃ العلماء ہی واپس آجانا چاہتے تھے، لیکن مسعود صاحب کی طبیعت بہت حساس واقع ہوئی تھی اس لیے ہر ایک سے یہی کہا ہوگا کہ سیّد صاحب کے حکم کی تعمیل میں جا رہا ہوں، ورنہ دل نہیں چاہ رہا ہے مگر اپنے قریبی دوست اور رفیق مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی سے دل کی بات کہہ ڈالی کہ سیّد صاحب کا فرمان ایک بہانہ بن گیا ورنہ لوگوں کو یہی لکھا ہے کہ سیّد صاحب کی حسب ہدایت جانا پڑ رہا ہے۔

---

(۳) چراغ راہ، مسعود عالم ندوی نمبر ص ۱۳۰

ندوۃ العلماء سے پٹنہ روانگی

خدا بخش لائبریری میں بحیثیت کٹیلاگر

مولانا مسعود عالم ندوی سیّد صاحب کے حکم سے ندوہ واپس تو آگئے، لیکن ان کا دل اب بھی ندوۃ العلماء میں نہ لگا۔ سیّد صاحب بھی اس بات سے واقف تھے کہ مسعود صاحب محض ان کے حکم سے ندوہ واپس آگئے ہیں ورنہ وہ وہاں کے ماحول سے دور ہی رہنا چاہتے ہیں اسی درمیان اورینٹل خدا بخش لائبریری پٹنہ کے سکریٹری نے سیّد صاحب کو ایک آدمی کے لیے لکھا، جو کٹیلاگر کی حیثیت سے لائبریری میں کام کرسکے، چنانچہ آپ کی نگاہ فوراً مسعود صاحب پر گئی، مسعود صاحب نے آپ کے حکم کے مطابق درخواست دی اور وہ منظور ہوگئی، اس طرح وہ ندوہ کے ماحول سے دور ہوگئے۔ ۱۶/دسمبر ۳۴ء کو پٹنہ آکر لائبریری کا کام شروع کیا، لیکن وہ اپنے اصل کام سے غافل نہ ہوئے، وہ ندوۃ العلماء کو اپنے مقصد کا صحیح معنوں میں علمبردار دیکھنا چاہتے تھے، اور اس کے لیے اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ پٹنہ میں کتب خانہ کی خاموش فضا میں انہیں زیادہ آرام تھا، والد محترم اور وطن سے قربت بھی ان کے لیے راحت کا باعث تھی، چنانچہ اپنے ایک خط میں مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی کو لکھتے ہیں:-

> ”اطمینان کی بات یہ ہے کہ میرے پٹنہ آجانے سے والد ماجد، اعزہ واحباب سب کو انتہائی مسرت ہے۔ پٹنہ کا ذی علم اور باذوق طبقہ بھی مطمئن ہے، اور سب خواہش مند ہیں کہ میرا قیام یہاں مستقل ہوجائے، کتب خانہ کی فضا بہت پرسکون ہے، کوئی افسر نہ ماتحت، نفیس عمارت الماریاں دیدہ زیب، کتابوں کی جلدیں نظر فریب، کام خاموشی کا، میرے کام کے نگراں

عظیم الدین صاحب ہیں (۱) آخر میں انگریزی کی تصحیح کے لیے ایک انگریز پروفیسر سے مشورہ لینا پڑتا ہے، کام بڑا ہے، کام پانچ سال کا ہے، توسیع ہو جائے گی، شاید دقت نہ ہو، ممکن ہے کہ یہ رائے قبل از وقت ہو۔ بہر صورت دو تین مہینے میں صحیح اندازہ ہو جائے گا۔ البتہ مستقل (Perma-nent Post) کے حصول کے لیے کچھ جدّو جہد کرنی پڑے گی جس کے لیے ابھی نفس تیار نہیں، ممکن ہے آئندہ اس ماحول سے متاثر ہونے کے بعد یہ چیز بھی کرلوں، ایک ندوی (حاجی معین صاحب) کی مثال تو بہت حوصلہ افزا ہے، وہ آٹھ سال رہنے کے بعد بھی ذرہ برابر نہیں بدلے، کسی سے نہیں ملے اور اسی جرم میں مستقل جگہ نہ مل سکی۔" (۲)

مولانا سیّد ابوالحسن ندوی لکھتے ہیں:

"لیکن وہ ماحول کے اثرات اور تقاضوں کے باوجود ملازمت پیشہ لوگوں کی سطح پر نہ اتر سکے، ان کی خودداری اس مقام کے شرائط پورا کرنے کے مانع رہی، پھر بھی ان کی اہلیت اور امتیازی قابلیت ان کے لیے سب سے بڑی سفارش تھی اور اسی بنا پر ان کی توسیع ہوتی رہی۔" (۳)

ایک خط میں مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی ہی کو لکھتے ہیں:

"مستقل تو نہیں ہوا کہ یہ سعادت ڈاکٹر سیّد محمود صاحب (۴) کے آستانے پر جبیں سائی کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی، جو کچھ بلا منت غیرے اور اللہ کے فضل و کرم سے ہو سکا، وہ یہ ہے کہ ایک سال کی توسیع ہو گئی

---

(۱) ڈاکٹر عظیم الدین احمد پی۔ایچ ڈی (سابق پرنسپل اورینٹل کالج لاہور) اور پروفیسر پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ۔

(۲) پرانے چراغ ص: ۳۳۲

(۳) ایضاً ص: ۳۳۲

(۴) ڈاکٹر سید محمود صاحب مرحوم جو اس وقت بہار میں وزیر ترقیات تھے

ہے اور جب تک کام باقی ہے اسی طرح توسیع ہوتی رہے گی، میرے تخمینہ سے بقیہ کام کم از کم سات سال کا ہے، یوں بڑھ جائے تو تعجب نہیں، اللہ کا ہر حال میں شکر ہے، کتنے مجھ سے اچھے اور ہونہار نوجوان بہت معمولی تنخواہوں پر کام کر رہے ہیں، کتنے بیکار ہیں، مجھ میں کوئی زیادہ اہلیت نہیں، کارساز حقیقی کا احسان ہے کہ اس نے ایک عاجز و درماندہ کے واسطے سے ایک شریف خاندان کی عزت اور ظاہری خودداری کا سامان بہم پہنچایا۔

فالحمد لله اولاً و آخراً" (۱)

پٹنہ میں آپ کی تعلیمی و تصنیفی سرگرمیاں

پٹنہ میں مولانا مسعود عالم ندوی کا قیام تقریباً سات سال دسمبر ۳۷ء تا اکتوبر ۴۴ء رہا، اس عرصے میں ندوۃ العلماء کی اصلاح کے لیے ہر ممکن کوشش جاری رکھی۔ سب سے پہلے انجمن طلبۂ قدیم ندوہ کی بنیاد رکھی جس کا پہلا اجلاس ۳۸ء میں پھلواری شریف، پٹنہ میں نہایت کامیاب رہا، اسی طرح ندوۃ العلماء کے لیے صوبہ بہار سے اعانت جمع کرنے کے واسطے انجمن "معین الندوۃ" کے نام سے بھی ایک انجمن قائم کی اور آپ اس کے نمائندے کی حیثیت سے ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامی کے رکن بھی تھے۔ اس کے علاوہ بہت سے علمی کام بھی انجام دیے۔ عربی پرچوں میں مضامین لکھنے کا سلسلہ برابر جاری رکھا، قاہرہ کے ہفتہ وار رسالہ "الفتح" کے مستقل مضمون نگار تھے، اور آپ کا شمار اس کے ممتاز اور پابندی سے لکھنے والوں میں ہوتا تھا۔

اسی دوران اردو میں بھی مضامین لکھنے کا سلسلہ شروع کیا، نومبر اور دسمبر ۳۸ء کے "معارف" میں امیر شکیب ارسلان کی کتاب "السید رشید رضا او صداقة اربعين سنة" کا خلاصہ اور اس پر تبصرہ لکھا، یہ اردو میں ان کا سب سے پہلا اہم مضمون تھا۔ جولائی

---

(۱) پرانے چراغ ص ۳۳۳

۳۹ء کے "معارف" میں ڈاکٹر ذکی علی مصری کی انگریزی کتاب "دنیا میں اسلام" کا خلاصہ اور اس پر تبصرہ لکھا۔

آپ اپنے عقائد و خیالات میں ہمیشہ سلفی رہے، قیام پٹنہ کے دوران بھی اپنے عقائد و خیالات پر مضبوطی سے جمے رہے بلکہ ان کی اشاعت اور تبلیغ میں زیادہ سرگرم ہو گئے، ایک خط میں مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی کو لکھتے ہیں:

"آپ کو حیرت ہوگی، میں یہاں آکر عقیدۃً زیادہ مولوی بلکہ ملا ہو گیا ہوں۔ مولانا سجاد صاحب سے بارہا ملاحدہ اور دہریوں کی مخالفت اور سیاسی حوصلہ شکنی پر گفتگو آئی، ممکن ہے، دہلی کی نجی کانفرنس میں وہ اسے پیش بھی کردیں، رات تشریف لے گئے ہیں دنیا نئی ہے، فضا بدلی ہوئی، پورے پٹنہ میں کوئی اپنا ہم خیال نہیں، کسے داستان درد سناؤں۔"(۱)

مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی مدّظلہ کیا خوب لکھتے ہیں:

"وہ (مسعود عالم ندوی) اپنے مخصوص تعلیمی خیالات اور افکار میں جن کے مجموعے کا نام "ندویت" ہے، نیز مذہبی خیالات و عقائد جن کے مجموعے کا نام مشہور عوام "وہابیت" ہے، نیز خاص اپنے علمی و ادبی ذوق میں جس کا عنوان "عربیت" ہے، خاصے متصلّب تھے اور جہاں رہتے اس کی دعوت و تبلیغ سے باز نہ رہتے۔ پٹنہ سے وہ ایک خط میں لکھتے ہیں: آپ کی یاد کس کس تقریب سے آتی ہے؟ کیا کہوں؟ میرا یہ اعتقاد ہے کہ آپ، عبدالسّلام صاحب اور مسعود سے زیادہ دنیا میں کوئی تین آدمی ہم خیال نہیں ہو سکتے، لیکن کس قدر تکلیف کی بات ہے کہ ایک الگ غیر اور اجنبی ماحول میں پڑا ہوا ہے، بہر حال یقین رکھئے کہ میں یہاں جب تک رہوں گا

---

(۱) پرانے چراغ ص ۳۴۳

"ندویت" مخصوص قسم کی وہابیت اور عربیت پھیلا تا رہوں گا، خواہ اس راہ میں شہید کیوں نہ ہو جاؤں۔"(۱)

اس کے علاوہ قیام پٹنہ کے دوران اور بھی بہت سے کام کیے، خاص کر نوجوان طبقہ میں اسلام کا تعارف کرایا، ان کے شبہات کو دور کیا۔ اس سلسلے میں آپ کے خاص رفیق محمد عاصم صاحب رقم طراز ہیں:

"پٹنہ آکر مسعود صاحب کا حلقۂ ملاقات بہت وسیع ہو گیا تھا، یوں بھی وہ جہاں رہے اپنے فرائضِ منصبی اور علمی مشغولیتوں کے ساتھ ساتھ نوجوانوں کی فکری، اصلاحی اور علمی تربیت کا سلسلہ شروع کر دیا۔ پٹنہ میں بھی انہوں نے یہ سلسلہ شروع کر دیا۔ آنے والوں میں بہت سے کمیونسٹ اور سوشلسٹ خیالات رکھنے والے نوجوان اور لیڈر بھی ہوتے، مسعود صاحب کو ان سے تبادلۂ خیال کا موقع ملا، ان سے اسلام، کمیونزم اور سوشلزم وغیرہ کے متعلق بحثیں رہتیں۔ یہاں پہنچ کر مسعود صاحب کو احساس ہوا کہ اس زمانے میں کمیونزم سے پوری طرح واقف ہونا اشد ضروری ہے تاکہ مسلمان نوجوانوں کو اس کی تباہ کاریوں اور اسلام کی خوبیوں سے متعارف کرایا جاسکے۔ چنانچہ انہوں نے کمیونزم کی مختلف کتابوں کو پڑھنا اور کمیونسٹ خیالات رکھنے والے بہت سے لیڈروں سے ملنا اور تبادلۂ خیال کرنا شروع کیا، جس کے نتیجے میں انہوں نے "اشتراکیت اور اسلام" کے نام سے ایک مفصل مضمون معارف میں شائع کرادیا، جو پورے کا پورا اس طرح شائع ہوا کہ پرچے میں اس کے سوا کوئی دوسری چیز نہ تھی، اسی زمانہ میں "عربوں کی قومی تحریک" سے متعلق انہوں نے ایک طویل مقالہ

---

(۱) پرانے چراغ ص ۳۴۴

"الہلال پٹنہ" میں شائع کیا، جسے بعد میں مکتبہ اردو (لاہور) والوں نے ان کی اجازت واطلاع کے بغیر پمفلٹ کی شکل میں شائع کر دیا۔"(۱)

آپ نے پٹنہ میں اپنے شاگردوں کا ایک حلقہ بھی پیدا کر لیا تھا، عربی زبان سیکھنے کی عام دعوت دے رکھی تھی، نوجوانوں کی علمی اور اصلاحی تربیت کی طرف بھی توجہ رہتی تھی، جیسا کہ ایک خط میں مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی کو لکھتے ہیں:

"پیشہ ور عربی طالب علموں کے علاوہ دوسرے اصحاب کو عربی سیکھنے اور پڑھنے کی عام دعوت دے رکھی ہے۔ فی الحال دو تین شاگرد ہوئے ہیں...... دو چار سوشلسٹ حضرات کو بھی رام کر رہا ہوں۔ میں نے ان سے کہا ہے کہ پہلے قرآن پڑھ لو، اس کے بعد تم کو اللہ میاں کے انکار و اقرار کا اختیار حاصل ہے، بے پڑھے اور بے سمجھے صرف مارکس کے کہنے پر وحدہ لاشریک کا انکار تو ایک "روشن خیال" نوجوان کو زیب نہیں دیتا، یہ فقرہ ان کے دلوں کو لگ گیا ہے۔"(۲)

ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں:

"اس جگہ اپنے کو لکھنؤ سے زیادہ پردیسی پاتا ہوں، میں یہاں بالکل غریب ہوں، میرے خیالات غریب، میری رہائش غریب۔

زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلماں ہوں میں

اس جگہ سے صرف اتنا تعلق پیدا ہوا ہے کہ میں نے مسلسل (Conveyss-ing) کے بعد اپنا ایک حلقہ پیدا کر لیا ہے۔ بلکہ ہم لوگوں کے مخصوص

---

(۱) چراغ راہ، مسعود عالم نمبر ص: ۱۳۱

(۲) پرانے چراغ ص: ۳۲۶

خیالات کی ایک چھوٹی موٹی دنیا بسنے لگی ہے، گو ابھی مختصر ہے جمال الدین سنوسی، سید احمد، اسماعیل شہیدین وغیرہم (رحمهم الله و نصرهم الله) سے آشنا ہو گئی ہے۔"(۱)

مولانا سجّاد بہاری کے انتقال کا آپ پر اثر

مولانا محمد سجّاد بہاری مرحوم جو خلافت تحریک کے مشہور لیڈر تھے، مسعود صاحب کو ان سے بڑی عقیدت و محبت تھی، ان کا بڑا احترام کرتے تھے، علمی مسائل میں ان کے ٹھوس دلائل کے معترف تھے، ان کی سوجھ بوجھ اور تقویٰ و پرہیزگاری کے بے حد قائل تھے۔ اکتوبر ۳۹ء میں ان کی Independent Party کے ہفتہ وار رسالے کی ادارت خفیہ طور پر اپنے ذمّے لے لی، ملازمت کی وجہ سے کھل کر سامنے نہ آسکتے تھے۔ مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں:

"مسعود صاحب معاصر علماء، سیاسی رہنماؤں اور بزرگوں میں سب سے زیادہ ابولمحاسن مولانا محمد سجّاد صاحب بہاری مرحوم کی اصابت رائے، خلوص اور فہم کے قائل تھے اور ان کو مرحوم سے نہ صرف عقیدت تھی، بلکہ محبّت اور ذاتی تعلّق بھی تھا، اور ان کی ذات سے بڑی تقویت اور سکون حاصل تھا، مولانا بھی مرحوم پر بڑی شفقت فرماتے تھے، اور بڑی توجہ سے ان کے مشورے اور خیالات سنتے تھے۔"(۲)

۱۸/نومبر ۱۹۴۰ء کو مولانا محمد سجّاد صاحب بہاری کا انتقال ہو گیا، مسعود صاحب کو اس حادثہ سے سخت تکلیف پہنچی، وہ اپنے آپ کو یتیم سا محسوس کرنے لگے، چنانچہ ایک خط میں مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی کو لکھتے ہیں:

"گھراؤ گانواں سے لوٹا تو خیال ہوا کہ آپ لوگوں سے ٹوٹا ہوا رشتہ جوڑوں،

---

(۱) پرانے چراغ ص: ۳۳۶

(۲) ایضاً ص: ۳۳۷

یعنی دو چار خط لمبے لمبے لکھوں کہ آہ! مخدومی مولانا سجّاد صاحب کی علالت کی خبر ملی، اور دو ایک روز میں حالت غیر ہونے لگی، تا آنکہ ۱۷/ شوال (۱۸/ نومبر) کو یہ پاک ہستی رہ گزر آخرت ہو گئی، ہم لوگوں پر کیا بیتی، ! اسے زبان سے بیان نہیں کر سکتا، دو چار دن تو ہوش و حواس قابو میں نہیں رہے، جس سے ملاقات ہوئی طرفین سے دیدہ باری ـــــ اور پھر مخصوص حالات نے اور بھی کچوکے لگائے، مرنے کے وقت گھر میں کفن کو بھی ایک کوڑی نہ تھی (بالکل لفظی معنوں میں) اور کیا لکھوں آپ جانتے ہیں کہ مجھے مولانا سے کتنا تعلق تھا، اور وہ بھی مجھے بہت مانتے تھے، پچھلے تین سالوں میں یہ تعلق اور بھی گہرا ہو گیا تھا، اب یہ حال ہے کہ پٹنہ کاٹے کھا رہا ہے۔"(۱)

انتقال کے فوراً بعد آپ نے ان کی زندگی اور کارناموں پر ایک کتاب شائع کرنے کا ارادہ کیا، چنانچہ فوراً ہی مختلف حضرات سے مقالے لکھوا کر اور خود بھی ایک اہم مضمون لکھ کر سب کو "محاسن سجّاد" نام سے ایک کتابی شکل میں شائع کر کے پورے ہندوستان میں تقسیم کرنے کی کوشش کی، کتاب کا پیش لفظ مولانا عبد الماجد دریا آبادی کے قلم سے ہے، اور علّامہ سیّد سلیمان ندوی کا بھی ایک اہم مضمون شامل کتاب ہے۔ کتاب کا پورا تعارف آگے آرہا ہے۔

عبد الوہاب نجدی پر آپ کی تصنیف

پٹنہ آکر مولانا مسعود عالم ندوی کی طبیعت ہشاش بشاش رہنے لگی، ہر طرح کا آرام مہیا تھا، کسی کی ماتحتی میں بھی نہ تھے، اس لیے بالکل آزادانہ طور پر اپنا علمی کام انجام دیتے تھے، بلکہ پٹنہ آکر تو علمی اور تحقیقی کام سے دلچسپی زیادہ بڑھ گئی تھی، انہی دنوں آپ

---

(۱) پرانے چراغ ص ۳۴۷

نے اپنی معرکتہ الآراء کتاب ''محمد بن عبدالوہاب ایک مظلوم وبدنام مصلح'' لکھنا شروع کی۔ اگر چہ ندوۃ العلماء کے زمانے میں سید احمد شہید اور اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ پر کام کرنے کا ارادہ مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی کے ساتھ کر چکے تھے۔ جیسا کہ مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں:

''اس کتاب سے پہلے مسعود صاحب سیّد صاحبؒ کی شہادت کے بعد کی تاریخ اور ان کی جماعت کی مجاہدانہ کوششوں کی روداد لکھنا چاہتے تھے، دارالعلوم کے قیام کے زمانے میں ہی کام اس طرح تقسیم کیا گیا تھا کہ یہ ناچیز سیّد صاحب کی سیرت لکھے، اور مسعود صاحب اپنا سفر بالا کوٹ سے شروع کریں۔ اسی دوران میں مسعود صاحب کو شیخ محمد بن عبدالوہاب کی سیرت و تاریخ لکھنے کا خیال پیدا ہوا، اور انہوں نے اس کام کو مکمل کر لیا۔''(۱)

مولانا کے خاص رفیق محمد عاصم صاحب لکھتے ہیں:

''ندوۃ العلماء ہی کے زمانے میں اپنے دوست مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی سے یہ طے کر لیا تھا کہ وہ سیّد احمد شہید اور مولانا شاہ اسماعیل شہید کی شہادت کے بعد کی تاریخ اور ان کی مجاہدانہ کوششوں کی روداد لکھیں گے، بعض لوگ ہندوستان کی اس پہلی اسلامی تحریک اور نجد کے مجدّد و مصلح شیخ محمد بن عبدالوہاب کی تحریک کو ایک یا آپس میں معاون تحریکیں سمجھ رہے تھے، مسعود صاحب نے جب اس بارے میں قیام پٹنہ کے دوران تحقیق کرنا شروع کی، اور محمد بن عبدالوہاب اور ان کی تحریک و عقائد کے متعلق بہت سی کتابیں پڑھنے کا انہیں اتفاق ہوا، تو ان کے سامنے بہت سی

---

(۱) پرانے چراغ ص ۳۴۰

ایسی چیزیں آئیں، جن سے عدم واقفیت کی بناء پر نجد کی اس اصلاحی تحریک کے متعلق خود مسلمانوں میں بہت سی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں، چنانچہ مسعود صاحب نے ارادہ کیا کہ سیّد احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید کی تحریک کے متعلق کتاب لکھنے سے پہلے محمد بن عبد الوہاب کی سیرت اور ان کی تحریک کے متعلق خالص علمی اور تحقیقی رنگ میں ایک کتاب لکھی جائے، انہوں نے یہ کام شروع کیا، اسی زمانے میں یہ کتاب مکمل ہوئی، اور اس کے پہلے دو باب معارف میں شائع ہوئے، یہی کتاب بعد میں "محمد بن عبدالوہاب ایک بدنام و مظلوم مصلح" کے نام سے شائع ہوئی، اگرچہ اس کتاب کے لکھنے کی تحریک ندوہ ہی کے زمانے سے ہو چکی تھی، چنانچہ وہابی تحریک کے متعلق مسعود صاحب نے "الضیاء" میں "الحرکة الوھابیة الھندیه السیاسه" ایک مضمون بھی لکھا جو بعد میں "الہلال" (پٹنہ) کے مختلف نمبروں میں ترجمہ ہو کر شائع ہوا، لیکن پوری کتاب لکھنے کا ارادہ پٹنہ ہی کے زمانے میں ہوا۔"(۱)

سیّد احمد شہید اور مولانا شاہ اسماعیل شہید کی تحریک کے سلسلے میں آپ نے اپنا مطالعہ برابر جاری رکھا، یہاں تک کہ پٹنہ ہی کے قیام کے دوران کتاب کے متعلق پورا مواد جمع ہو گیا، لیکن کتاب کی ترتیب بعد میں جالندھر میں ہوئی، انہوں نے یہ کتاب "ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک" کے نام سے مکمل کی۔

مولانا سندھی کی کتاب کا جواب

اسی دوران مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کی کتاب "شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک" شائع ہوئی، جس میں بعض ایسے نئے حقائق و انکشافات درج تھے، جو تمام لوگوں

---

(۱) چراغ راہ، مسعود عالم ندوی نمبر ص ۱۳۲

کے لیے باعث تکلیف تھے۔ مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

"اسی عرصے میں مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کی کتاب "شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک" نکلی۔ اس کتاب میں بعض ایسے نئے حقائق و انکشافات تاریخی رنگ میں پیش کیے گئے تھے، جو ہم سب لوگوں کے لیے موجب حیرت بھی تھے اور باعث تکلیف بھی۔ اس کتاب میں سیّد صاحب کی بے تکلف تحریک و تنظیم کو ایک "خیالی اسٹیٹ" کے رنگ میں پیش کیا گیا تھا، جس کے سیّد صاحب محض فوجی افسر اور آلہ کار تھے اور حضرت شاہ اسحاق صاحب جن کو مولانا الصدر الحمید کے نام سے یاد کرتے ہیں۔" صدر ریاست اور نگرانِ اعلیٰ، نیز اس میں اہل مغرب یا مرکزی بورڈ (حضرات دہلی) اور اہل مشرق (اہل صادق پور) کے درمیان ایسی رقابت دکھائی گئی تھی جو کبھی سورج بنسی اور چندر بنسی خاندان میں تھی، اور اسی رقابت اور اہل صادق پور کی خود رائی کو تحریک کی ناکامی کا سبب گردانا گیا تھا۔ اس بارے میں خود سیّد صاحب کے متعلق فاضل مصنف کے قلم سے ایسے جملے نکل گئے ہیں کہ گویا وہ بھی دہلی کے مرکز کے مشوروں اور ہدایتوں کے پابند نہ رہے، اور اس سے نقصان پہنچا، یہ محض ایک خیالی ریاست کا نقشہ تھا۔ جس میں تاریخی تحقیق سے زیادہ مولانا کی ذہانت، قوتِ تخیلی اور تنظیمی دماغ کام کر رہا تھا، واقعہ یہ ہے کہ اس کتاب کی اشاعت سے بڑی غلط فہمیاں پیدا ہوئیں، بالخصوص اس جماعت کی بڑی حق تلفی ہوئی، جو ہندوستان کی سب سے بڑی مجاہدانہ اور سر فروش جماعت اور سیّد صاحب کے حقیقی جانشین اور فدائی تھے۔ میں نے مسعود صاحب کو اس کتاب کی طرف توجہ دلائی اور ان سے خواہش کی کہ وہ اس کا جواب لکھیں۔"(۱)

---

(۱) پرانے چراغ ص ۳۴۰

مسعود صاحب کو جواب لکھنے میں اگرچہ ادب مانع ہو رہا تھا، لیکن بعض احباب کے مسلسل اصرار اور خاص کر مولانا ابوالحسن علی ندوی کی خواہش پر اس کتاب کا جواب لکھنے کے لیے تیار ہو گئے۔ چنانچہ ایک خط میں مولانا علی میاں ندوی کو لکھتے ہیں:

”جی ہاں مولانا سندھی کا رسالہ ایک ہفتہ ہوا، میں نے دیکھا، اور مطالعہ کے دوران یہ ارادہ کرتا جاتا تھا (کہ اس کا جواب لکھوں) اب ارادہ ہوتا ہے کہ اسے لکھ ڈالوں، انشاء اللہ مفصل اور طویل مضمون ہوگا، جی چاہتا ہے کہ یہ نوٹ آپ کے پاس بھیج دوں، اور آپ اسے دیکھ کر فوراً واپس کر دیں، مگر شرط یہ ہے کہ جلد۔“(۱)

ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں:

”ہاں تو میں آپ سے بے حد خفا تھا، خط پر خط لکھے مگر جواب ندارد۔ آخر یہ کہاں کی مولویت ہے، آپ نے مجھے تو مولانا سندھی سے بھڑا دیا اور خود الگ جا بیٹھے۔ خیر خاکسار نے اس سلسلے کے دو مضمون لکھ لیے، پہلا مضمون فروری کے معارف میں چھپ گیا، اس میں صرف (سیّد صاحب اور مودودی صاحب کی زبان میں) سیّد مظلوم کی مدافعت کی گئی ہے، ضمنی طور پر ان کے ثناخوانوں اور منقبت نگاروں کی بھی مدافعت ہو گئی ہے، پہلا مضمون صرف سیّد صاحب کے متعلق ہے، معارف کے ۳۵ صفحوں میں آیا ہے، دوسرا اس کا جواب ضرور لکھوں گا، صرف تامل اس بات سے تھا کہ کہیں اہل دیوبند اس تنقید کو ”مدرسہ اور دبستان کے اختلاف پر محمول نہ کریں بہرحال لکھنا ضرور ہے، آج کل میں فارغ بھی ہوں آپ آجائیں تو مشورہ کر کے لکھ ہی ڈالوں۔“(۲)

---

(۱) پرانے چراغ ص: ۳۴۱

(۲) ایضاً [illegible]

مسلسل تین مضامین لکھ کر مسعود صاحب نے ان کو معارف میں شائع کروادیا، جو بعد میں "مولانا سندھی اور ان کے افکار و خیالات پر ایک نظر" کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہوئے۔

جماعت اسلامی ہند سے وابستگی

آپ کا مسلک

مولانا مسعود عالم ندوی اگرچہ اہل حدیث تھے، اور چاروں ائمہ میں سے کسی کی تقلید نہیں کرتے تھے، لیکن ہمیشہ اہل حدیث حضرات کی جماعتی عصبیت کے شاکی رہے۔ آپ شروع ہی سے فقہی مسائل میں تحقیقی مسلک رکھنے والے تھے، اسی وجہ سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ آپ کے مسلک اور فکر و نظر پر شبلی، سید سلیمان ندوی، ابوالکلام آزاد، مفتی کفایت اللہ، ابوالمحاسن محمد سجاد، رشید رضا مصری، شیخ محمد عبدہ، جمال الدین افغانی اور علامہ اقبال کی گہری چھاپ تھی۔ مولانا تقی الدین نعمانی لکھتے ہیں:

> "آپ (مسعود عالم ندوی) شبلی کی جودتِ طبع اور ہمہ گیریت، سیّد ندوی کے تفقہ فی الدین اور فہم دین کی گہرائی، آزاد کی بے مثال عبقریت، اقبال کے اسلامی پیغام اور دعوت انقلاب، سجاد کی اصابت رائے، کفایت اللہ کی علمی و فکری فتویٰ نویسی پر مثالوں پر مثالیں دیتے جاتے اور پر خلوص نذرانۂ عقیدت پیش کرتے، لیکن امامت کسی کی تسلیم نہ تھی۔ آنکھ بند کر کے کسی کی فکری اور نظری تقلید کے سخت مخالف تھے۔"(۱)

مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ کی بھی تقلید اس طرح نہ کی کہ ان کی کسی رائے سے اختلاف نہ کیا ہو، ہاں یہ ضرور ہے کہ مولانا کی اسلامی فکر، مسلمان اور اسلام کے بارے میں ان کے نظریات سے اس حد تک اپنے آپ کو، اپنی ذہنی ساخت اور طبیعت کے میلان و رجحان کو ہم آہنگ پایا اور جذبات میں بیداری کی ایک ایسی لہر پیدا ہوئی کہ تمام

---

(۱) ماہنامہ زندگی، اگست ۱۹۸۴ء ص: ۳۳

مخالفتوں کے باوجود اپنے آپ کو جماعت اسلامی کے لیے وقف کر دیا۔ اور تادم مرگ اسی سے وابستہ رہے۔

جماعت اسلامی میں شمولیت

مولانا مسعود عالم ندوی ندوۃ العلماء کے زمانے ہی سے جماعت اسلامی کے فکری و دینی مزاج سے ہم آہنگ ہو گئے تھے۔ مولانا مودودیؒ کے ماہنامہ رسالہ ''ترجمان القرآن'' کے مضامین کے زبردست مداح اور ان کی افادیت کے قائل تھے۔ ترجمان القرآن کے مضامین آپ کے دل کی آواز تھی، مولانا مودودی کی تحریروں میں آپ اسلامی انقلاب کی جھلک نمایاں طور پر محسوس کرتے تھے۔ مولانا تقی الدین نعمانی لکھتے ہیں:

> ''ترجمان القرآن کی اذانِ حق سے نیند کے متوالوں اور خوابیدہ جذبات میں بیداری کی کیسی لہر پیدا ہوئی؟ اس سوال کا جواب مستقبل کا مورخ دے گا۔ اور حال اس پر روشن شہادت پیش کر رہا ہے۔ مجھے تو صرف یہ بتانا ہے کہ اس دعوت حق اور اقامتِ دین کے پیام کا اثر مسعود مغفور کی زندگی پر کیا ہوا، اور پھر اس دعوت حق کو قبول کرنے کے بعد اس کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے کس طرح اپنی متاعِ حیات کی بازی لگا دی، اور تادم واپسیں یہ کہتے ہوئے اور عملی شہادت دیتے ہوئے جان عزیز جاں آفریں کے حوالے کی کہ ؎
>
> جان دی دی ہوئی اسی کی تھی
>
> حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔''(۱)

مسعود صاحب ترجمان القرآن بہت شوق اور جذبہ سے پڑھتے، اس کے مضامین اور مولانا مودودی کے اسلام اور مسلمانوں کے سلسلے میں نظریے کو بڑی اہمیت دیتے تھے،

---

(۱) ماہنامہ زندگی، اگست ۱۹۸۴ ص: ۳۴

دوسروں کو اس کے مطالعے کا مشورہ دیتے۔ مولانا کے خاص رفیق محمد عاصم صاحب لکھتے ہیں:

"وہ (مسعود صاحب) خود بھی فطرتاً حساس اور نقاد واقع ہوئے تھے۔ وہ اپنی تحریروں میں بھی اسلام اور مسلمانوں کا فرق ملحوظ رکھتے تھے۔ وہ بھی تجدید کے داعی اور پرزور حامی اور تجدد کے مخالف تھے۔ فقہی آراء و مسائل میں وہ شروع سے ہی تحقیقی مسلک رکھنے والے تھے (جیسا کہ مولانا مودودی کا تھا) ان کا ذوق کسی ایک فقہی مذہب کے التزام و تقلید سے "ابا" کرتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے آپ کو اہل حدیث کہلانا کبھی پسند نہ کرتے تھے، بلکہ ہمیشہ اہل حدیث حضرات کے تحزب اور جماعتی عصبیت کے شاکی رہے۔ اگست ۱۹۴۱ء میں جب جماعت اسلامی کی باقاعدہ تشکیل ہوئی، تو وہ بھی جماعت کے ارکان میں شامل ہونا چاہتے تھے، لیکن اپنی کمزوری اور خرابی صحت کی بناء پر قدم آگے بڑھانے میں تساہل تھا، لیکن مولانا مودودی کے ایک خط نے ان کے تمام تذبذب کو ختم کر دیا۔ اور اسی سال انہوں نے اپنے آپ کو جماعت کی رکنیت کے لیے پیش کر دیا۔ امیر جماعت نے انہیں صوبہ بہار کی جماعت کا امیر مقرر کر دیا۔"(۱)

اس طرح مسعود صاحب کا جماعت اسلامی سے تنظیمی تعلق قائم ہو گیا۔ اور ان کا شمار جماعت اسلامی کے زعماء کی صف میں ہونے لگا۔ اپنی خداداد صلاحیتوں کی بنا پر وہ اس کے مستحق بھی تھے۔ جیسا کہ مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی رقمطراز ہیں:

"مسعود صاحب کے تجربات و مشاہدات، ان کی فطری صلاحیتوں و مناسبتوں، ان کے فکر و مطالعہ اور ان کے احساس و جذبات نے ان کو جماعت اسلامی سے قریب تر کر دیا۔ یہاں تک کہ ان کی وابستگی اور

---

(۱) چراغ راہ، مسعود عالم ندوی نمبر ص ۱۳۳

صلاحیتوں نے ان کو اس کی قیادت کی صف میں پہنچا دیا۔ خیالات کا تنوع، ذہن کے نمو اور زندگی کی علامت ہے، اور زندہ اور ترقی پذیر انسانوں کے افکار، زاویہ نظر اور ذوق میں ضرور اختلاف ہوگا، اور ہونا چاہیے۔ ہم دونوں رفیق بحمد اللہ زندہ ہیں (اس وقت مسعود صاحب حیات تھے) اور ہمارا ذہن نمو وارتقاء سے محروم نہیں ہوا ہے، اس لیے ہمارے خیالات و رجحانات کا تنوع بالکل قدرتی ہے۔"(۱)

لائبریری سے استعفا اور پنجاب روانگی

جماعت اسلامی کا رکن بننے کے بعد مولانا مسعود عالم ندوی کو صوبہ بہار کا امیر جماعت منتخب کیا گیا۔ آپ جماعت کا کام بحسن خوبی انجام دے رہے تھے۔ اور خدا بخش لائبریری میں بھی اپنے فرائض بحیثیت کٹیلاگر بخوبی انجام دے رہے تھے۔ ادھر جماعت کا لٹریچر اور مولانا مودودیؒ کی کتابیں اردو زبان میں شائع ہو کر مقبول ہو رہی تھیں، اور خاص کر نوجوان طبقہ ان کتابوں کے مطالعے سے اسلام سے قریب ہو رہا تھا، اور جماعت اسلامی کا حلقہ بڑا وسیع ہو رہا تھا، لیکن ان تمام کتابوں کا عربی میں ترجمہ کرنے کا کام نہیں ہو پا رہا تھا۔ مولانا مودودی کو ترجمہ کی ضرورت کا شدت سے احساس تھا، تاکہ عرب عوام تک یہ دعوت پہنچے، اس کے ساتھ ساتھ ایک عربی ماہنامے کے اجراء کا بھی ارادہ تھا۔ انہوں نے اپنی اس تجویز کا اظہار مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی سے کیا جو اس وقت جماعت اسلامی کے ایک اہم رکن تھے، اور ان سے اس کام کی ذمہ داری قبول کرنے کی فرمائش کی، لیکن مولانا ندوی نے مسعود صاحب کا نام پیش کیا۔ جیسا کہ خود مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی مدظلہ لکھتے ہیں:

"۱۹۴۱ء میں مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ لکھنؤ آئے، اور ندوۃ العلماء کے

---

(۱) ماہنامہ الفرقان، ذی الحجہ ۱۳۶۹ھ ص ۴۱

مہمان خانے میں قیام کیا، انہوں نے مجھ سے ایک عربی رسالے کے اجراء کی تجویز کا تذکرہ کیا اور یہ خیال ظاہر کیا کہ میں اس کی ادارت کی ذمہ داری قبول کرلوں، میں نے بے تکلف عرض کیا کہ اس کام کے لیے موزوں ترین شخص مولانا مسعود عالم ندوی ہو سکتے ہیں، اور اپنے خصوصی تعلق کی بناء پر اس کا ذمہ لیا کہ میں ان کو اس خدمت کے لیے راضی کرلوں گا۔ اس سلسلے میں مولانا سے میری خط و کتابت بھی ہوئی، اور وہ اس پر آمادہ ہوگئے۔ انتظامی مشکلات کی بناء پر رسالے کا اجراء تو نہیں ہوا، لیکن ۴۴ء میں مسعود صاحب جماعت کی عربی نشر واشاعت کے شعبے کے انچارج اور کلیتہً اس کام کو انجام دینے کے لیے جالندھر منتقل ہوگئے۔"(۱)

مسعود صاحب کے لیے خرابی صحت کی بناء پر اپنا وطن چھوڑ کر پنجاب آنا بڑا مشکل تھا، اور دوسری چیز جو ان کی راہ میں حائل تھی وہ اپنے والد محترم اور استاذ مکرم سید سلیمان ندویؒ کی رضامندی تھی۔

آپ مولانا سید سلیمان ندوی کی اجازت کے بغیر کوئی قدم نہ اٹھاتے تھے، والد صاحب تو خیر کسی نہ کسی طرح رضامند ہوگئے اور جانے کی اجازت بھی دے دی، لیکن مولانا سید سلیمان ندوی ان کے سفر سے خوش نہ تھے، مسعود صاحب کی زندگی میں یہ بڑی آزمائش کا وقت تھا، ایک طرف اپنا عقیدہ دوسری طرف سید صاحب کے تعلقات، لیکن آخر کار انہوں نے اپنے ارادہ کو عملی جامہ پہنانے کا تہیہ کرلیا اور راہ حق کے تقاضوں پر لبیک کہا اور اس بڑی آزمائش میں اللہ نے آپ کو ثابت قدم رکھا۔ مولانا تقی الدین نعمانی لکھتے ہیں:

"جماعت اسلامی کی تاسیس کے بعد دعوت حق کے ایسے داعی بن گئے کہ وطن عزیز کو خیر باد کہا، اور ہجرت کی براہمی و محمدی سنت کی سعادت پائی۔

---

(۱) پرانے چراغ ص ۳۴۵

سرکاری منصب جلیل کو جس کے حصول کے لیے دین اور زہد و تقویٰ کے ٹھیکیداروں کو دورِ اقتدار پر دین و ایمان کی بازی ہارتے اور جبہ سائی کرتے بارہا دیکھا گیا ہے، اس طرح پائے تحقیر سے ٹھکرا دیا جیسے ٹھیکرے کو راہ رو ٹھکراتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے، علائق دنیا اور عیش و راحت سے دین کے استیلا اور اقامت دین کے لیے اس طرح دامن جھاڑ کر چلے کہ سلف صالحین کی ایمان افروز سنّت کی یاد تازہ کردی۔ آسمان ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے! اولاً راہ حق کے راہی بنے اور پھر راہبر و رہنما، اس راہ میں قدم رکھتے ہی نہ جانے کتنے احباب و مخلصین کے خلوص و محبت کی قربانی بہ خندہ پیشانی گوارا کی، بڑی بڑی شخصیتوں کی شفقت اور توجہ سے محرومی پسند کی، مگر راہ حق کے تقاضوں کو شرمندہ نہ ہونے دیا اور

مٹ نہیں سکتا کبھی مردِ مسلماں کہ ہے
اس کی اذانوں سے فاش سرّ کلیم و خلیل

کے سو فیصدی مصداق ہوئے۔

علامہ سیّد سلیمان ندوی سے بے پناہ عقیدت کے باوجود جماعت اسلامی کے اقامت دین کے مقصد اور طریق کار پر تبادلۂ خیال کرتے اور سیّد صاحب کی رائے اور وجہ اختلاف معلوم کرنے کی کوشش کرتے، سیّد صاحب کو جماعت اسلامی کے مقاصد اور طریق کار سے بنیادی اختلاف قطعاً نہ تھا، تعبیر مقاصد کے اسلوب اور طرز تعبیر سے جزوی اختلاف تھا، اور یہ کوئی اہم بات نہیں ہے۔ ہر صاحب فکر و نظر عالم کے علم و نظر کا یہ واجبی حق ہے۔ اس امر اختلاف میں سیّد صاحب نے بارہا فرمایا:

مسعود صاحب! مجھے جماعت اسلامی کے مقصد اقامت دین سے قطعاً

اختلاف نہیں ہے، ہاں بعض امور میں طرز تعبیر سے اختلاف ہے جیسے: لفظ "تحریک" "لیڈر" وغیرہ۔

مسعود صاحب نے انتہائی مودبانہ انداز میں اس طرح کے کئی الفاظ کی نشان دہی خود سیّد صاحب کی تحریروں میں کی۔ سیّد صاحب ایمان افروز تبسم کے ساتھ خاموش ہو جاتے اور فرماتے: اللہ تعالیٰ آپ سب کو اخلاص عمل و نیت کی نعمت سے نوازے! اس دعائے اخلاص عمل کے نتیجے میں ثمرات "قرار داد مقاصد" کی صورت میں سیّد صاحب نے نہ صرف اپنی نظر سے مشاہدہ فرمایا، بلکہ قرارداد مقاصد کے مبارک جہاد میں عملاً شریک رہے۔ اللہ ان کی دائمی خواب گاہ کو نور زعفران سے پر نور فرمائے، آمین!"(۱)

خود مولانا مسعود عالم ندوی اس آزمائش کے بارے میں مکاتیب سلیمان کے ایک خط کے حاشیے میں لکھتے ہیں:

"میری زندگی میں اب تک اس سے بڑی اور کوئی آزمائش نہیں آئی۔ ایک طرف اپنا عقیدہ اور مسلک جسے پورے انشراح اور اطمینان قلب کے ساتھ اختیار کیا تھا، دوسری طرف استاد محترم کے تعلقات، میں نے گزشتہ بارہ سالوں میں جس طرح ان دونوں کے نباہنے کی کوشش کی ہے، اور اس کے لیے جو جو جتن کرنا پڑے ہیں، انہیں اللہ ہی بہتر جانتا ہے، بہر حال خوشی کی بات یہ ہے کہ حضرت الاستاذ آہستہ آہستہ جماعت اسلامی سے بہت قریب آگئے تھے، اور ان کی بدگمانیاں بڑی حد تک دور ہو گئی تھیں، اور اس سے زیادہ خوشی مجھے اس بات کی ہے کہ اس خادم کی وفاشعاری کا ان پر آخر وقت تک اثر رہا۔ یہ اللہ کا فضل ہے۔"(۲)

---

(۱) ماہنامہ زندگی، اگست ۱۹۸۴ء ص: ۳۴۔۳۵

(۲) مکاتیب سلیمان ص: ۱۲۲

شوال ۶۳ھ نومبر ۴۴ء کی آخری تاریخوں میں پٹنہ سے پنجاب روانہ ہوگئے، اور جماعت اسلامی کے عربی نشر واشاعت کے شعبے کے انچارج متعین ہوئے۔

دار العروبہ کا قیام

پٹنہ سے روانہ ہو کر آپ سیدھے لاہور آئے، اور کچھ دن قیام کر کے لاہور سے مرکز جماعت اسلامی پٹھان کوٹ پہنچے، یہاں مستقل قیام کرنے کا ارادہ تھا، اور یہیں سے نشر واشاعت کا کام اور عربی ماہنامہ جاری کرنے کا ارادہ بھی تھا۔ لیکن مسعود صاحب کی طبیعت یہاں خراب رہنے لگی، اور یہاں کی آب و ہوا آپ کی صحت کے لیے موافق ثابت نہ ہوئی، چنانچہ مولانا مودودی اور دوسرے احباب کے مشورے سے آپ پٹھان کوٹ سے جالندھر منتقل ہوگئے، اور یہیں کام شروع کرنے کا ارادہ کیا، مولانا جلیل احسن ندوی مرحوم بھی آپ کے ساتھ تھے، چنانچہ شعبۂ نشر واشاعت کا نام **دار العروبۃ للدعوۃ الاسلامیہ** طے پایا۔

عروبہ دراصل عربی تہذیب (جو دینی تہذیب کے ہم معنیٰ ہے) کو کہتے ہیں لیکن آج کل یہ لفظ عربی قومیت کے لیے بھی استعمال ہونے لگا ہے۔ اس لیے دار العروبہ کے ساتھ للدعوۃ الاسلامیۃ کا بھی اضافہ کیا گیا، تاکہ قومیت کا شبہ بھی اگر پیدا ہو، تو اس کا ازالہ ہو سکے۔ دار العروبہ سے جو ماہنامہ جاری کرنے کا ارادہ تھا، اس کا نام "الہدیٰ" طے کر لیا گیا۔

مسعود صاحب کا قیام جالندھر میں اگست ۴۷ء تک رہا، اس عرصے میں انہوں نے متعدد کام انجام دیے۔ جالندھر آنے کے فوراً بعد انہیں عربی لکھنے میں وہ روانی محسوس نہ ہوئی، جو "الضیاء" کے زمانے میں تھی۔ لہٰذا انہوں نے کچھ عرصہ صرف عربی پڑھنے کا ارادہ کیا، تاکہ عربی میں پہلی والی روانی آجائے۔ چنانچہ محمد عاصم صاحب لکھتے ہیں:

> "ندوہ چھوڑنے کے ایک دو سال بعد تک تو مسعود صاحب نے اپنی عربی تحریر کا سلسلہ جاری رکھا، لیکن جنگ عظیم کے زمانے میں جب عربی ڈاک

کا سلسلہ منقطع ہوا، تو مسعود صاحب نے بھی مجبوراً عربی پرچوں میں اپنے مضامین کا سلسلہ ختم کر دیا۔ معارف اور دوسرے رسالوں میں اپنے اردو مضامین کا سلسلہ شروع کیا۔ اب پنجاب آنے کے بعد انہیں عربی لکھنے میں وہ روانی محسوس نہ ہوئی، جو انہیں "الضیاء" کے زمانے میں محسوس ہوتی تھی، اس لیے انہوں نے تہیہ کر لیا کہ کچھ مدت عربی پڑھنے اور صرف عربی پڑھنے کا سلسلہ جاری رکھا جائے، چنانچہ ایک سال تک "الفتح" اور دوسرے عربی رسالوں کے فائل اور ادبی کتابیں پڑھتے رہے کوئی اہم قابل ذکر تحریری کام نہیں کیا، صرف مولانا ابوالحسن علی ندوی کی کتاب "القراۃ الراشدۃ" کا مقدمہ لکھا۔ اس کی وجہ اگرچہ بے اطمینانی، بار بار نقل مکانی اور صحت کی مسلسل خرابی بھی تھی، لیکن اصل وجہ یہی تھی کہ مسعود صاحب اپنے قلم میں وہی روانی لانا چاہتے تھے، جو الضیاء کے زمانہ میں وہ محسوس کرتے تھے۔ اس زمانے میں انہوں نے اپنی کتاب ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک بھی مرتب کی، جس کا مواد اگرچہ پٹنہ ہی کے زمانے میں جمع کر لیا تھا، لیکن اس کی ترتیب نہ دی جا سکی تھی۔"(۱)

جالندھر میں قیام کے دوران مسعود صاحب کا معمول تھا، کہ عصر کے بعد برآمدے میں بیٹھ کر چائے پیتے اور دارالعروبہ کے رفقاء مولانا کے اردگرد بیٹھ کر استفادہ کرتے اور آپ ہر طرح کے سوالوں کا مدلل اور تشفی بخش جواب دیتے، حالات حاضرہ اور عالمی سیاست پر تبصرہ فرماتے، جماعت اسلامی کے مقاصد اور طریق کار کا بیان بڑے دلنشیں انداز میں کرتے، اسلام کے عروج و زوال کی داستان اس طرح سناتے گویا کہ آپ کے سامنے سب کچھ ہوا ہو۔ عربی زبان و ادب پر بڑی طویل بحث کرتے اور اس کی خصوصیات

---

(۱) چراغ راہ، مسعود عالم ندوی نمبر ص: ۱۳۴

بیان کرتے۔ دار العروبہ کے ایک رفیق عبید الرحمٰن حماد صاحب اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

"نماز عصر کے بعد کا وقت فرصت و فراغت اور تفریح کا ہوتا، نماز کے فوراً بعد میں اور قطبی صاحب مل کر چائے بناتے، چائے تیار ہونے کے بعد مولانا ہم دونوں کو ساتھ لے کر برآمدے میں دری پر بیٹھ جاتے، چائے کا دور چلتا رہتا، اور باتیں ہوتی رہتیں، ویسے مولانا ہر وقت ہشاش و بشاش رہتے، اور ہم جیسے "خردوں" اور شاگردوں کے ساتھ بھی برابر والوں اور دوستوں جیسا برتاؤ کرتے، لیکن خصوصیت سے چائے نوشی کے وقت تو بالکل بے تکلف ہو جاتے، اور کھل کر گفتگو فرمایا کرتے اپنی بیتی ہوئی زندگی کے حالات سناتے، واقعات گزشتہ کا تذکرہ کرتے، حالات حاضرہ اور سیاست عالم پر تبصرہ فرماتے، دنیائے اسلام کے عروج و زوال کی داستان سناتے، اقوام دوراں کے ارتقاء و انحطاط کے وجوہ بتاتے، انقلابات زمانہ کے اسباب و علل پر روشنی ڈالتے، دنیا کی اہم تحریکات کے نشیب و فراز اور ان کی کامیابی و ناکامی کا تجزیہ کرتے، ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک کی روداد اس انداز سے سناتے، جیسے یہ ان کا آنکھوں دیکھا حال ہو، عربی لٹریچر کی خصوصیات بیان کرتے، عربی زبان کے ادیبوں اور شعراء کا تذکرہ فرماتے، عربی اشعار پر نقد و تبصرہ کرتے، جماعت اسلامی کے روح رواں تو وہ تھے ہی، پھر اس کا ذکر وہ کیوں نہ فرماتے، اکثر و بیشتر ان کی گفتگو کی تان جماعت اسلامی کے ذکر پر آکر ٹوٹتی تھی۔ سلسلہ بیان کا آغاز کہیں سے کیوں نہ ہو، انجام کار اس کی کڑیاں جماعت اسلامی ہی سے آکر مل جایا کرتی تھیں۔ ذکر ہو رہا ہے سیّد احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کی برپا کردہ تحریک اسلامی کا، لیکن بین الکلام میں تمنا جھلک رہی ہے جماعت اسلامی کے روشن

مستقبل کی بات چل رہی ہے عالم اسلام کے انقلاب کی، مگر آمد بر سر مطلب، جماعت اسلامی کی اہمیت اور ضرورت کا اظہار ہے۔ غرض پیکر نحیف ونزار میں مجاہدانہ روح انگڑائیاں لے رہی ہوتی، اور ہم نہایت حیرت واستعجاب کے ساتھ مشاہدہ کرتے ہوتے، مولانا کی ذات معلومات کا بحر ذخار تھی، اس سمندر کے تموج کا ان آنکھوں نے شرف مشاہدہ حاصل کیا ہے۔"(۱)

ممالک عربیہ کا سفر

دارالعروبہ کا کام پورے زور و شور سے ہو رہا تھا، اور عربی میں ترجمے کا کام بھی مختلف حضرات مسعود صاحب کی نگرانی میں انجام دے رہے تھے، اور مسعود صاحب پورے انہماک کے ساتھ مولانا مودودیؒ کی کتابوں کے ترجمے کر رہے تھے، اب آپ کا شمار جماعت اسلامی کے سربراہوں میں ہونے لگا، مجلس شوریٰ کے تادم واپسیں رکن رہے، مولانا مودودیؒ کی زبان میں کہنا چاہیے کہ آپ مودودی کے دست و بازو بنے رہے، عربوں میں جماعت اسلامی کی دعوت کو عام کرنے میں آپ تن من دھن سے جٹ گئے، مولانا مودودیؒ کی چھوٹی چھوٹی کتابوں کے ترجمے ہزاروں کی تعداد میں چھپ گئے تھے، لیکن عرب ممالک تک یہ کتابیں نہیں پہنچ پا رہی تھیں۔ اس سلسلے میں محمد عاصم صاحب جو دارالعروبہ کے ایک اہم رفیق تھے، لکھتے ہیں:

"دو ڈھائی سال کی کوششوں کے بعد اندازہ ہوا، کہ جب تک عرب ممالک کا دورہ نہ کیا جائے، یہاں رہتے ہوئے ان ممالک میں کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ عربی رسالے کئی کئی ہزار کی تعداد میں چھپ گئے تھے، مگر باہر کہیں نہیں جا رہے تھے۔ لہٰذا مسعود صاحب نے عزم کیا کہ عرب ممالک کا ایک دورہ

---

(۱) ماہنامہ [illegible] ۱۹۵۶ء ص ۳۴-۳۵

کیا جائے۔ بغداد میں ان کے استاد شیخ تقی الدین الہلالی (جو اب جرمنی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی لے آئے تھے) آکر مستقل طور پر قیام پذیر ہو گئے تھے۔ مسعود صاحب نے فیصلہ کیا کہ سب سے پہلے عراق جایا جائے۔ اس کے بعد اگر حالات سازگار ہوئے اور مالی وسائل نے اجازت دی تو دوسرے ممالک میں جایا جا سکتا ہے۔ فروری ۴۹ء کے وسط میں امیر جماعت سے اجازت لینے اور دارالعروبہ کے کام کو سمجھانے کے لیے راولپنڈی سے لاہور آئے۔ چھ ماہ کا معاوضہ پیشگی لیا، یعنی مصارف سفر کے لیے جماعت سے کوئی رقم نہ لی، اور یکم مارچ ۴۹ء کو کراچی روانہ ہو گئے۔ ڈیڑھ ماہ تک پاسپورٹ کی کوشش کرتے رہے، لیکن کامیابی نہ ہوئی، آخر عراق کے لیے زیارت کا عارضی پاسپورٹ لے کر ۲۸ اپریل ۴۹ کو کراچی سے بصرہ روانہ ہو گئے، اس سفر میں ان کے ساتھ یہ عاجز بھی تھا۔"(۱)

اس سفر کے سلسلے میں مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی رقم طراز ہیں:

"۴۹ء میں انہوں نے عراق کا سفر کیا، جس کی ان کو مدتوں سے آرزو تھی۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ ۴۳ء میں انہوں نے بغداد وزبیر کی بالکل تیاری کر لی تھی، مگر ان کو پاسپورٹ نہیں مل سکا تھا اور سفر ملتوی ہو گیا تھا، وہ سفر اگر میسّر بھی آتا، تو صرف علمی ترقی اور ادبی ذوق کے لیے ہوتا۔ یہ سفر بڑے بلند عزائم اور مقاصد کے ساتھ تھا۔ اب وہ اپنی کتابوں اور ادبی شہرت کی بناء پر علمی و دینی حلقوں میں روشناس اور ایک دعوت و تحریک (جماعت اسلامی) کے نقیب و ترجمان سمجھے جاتے تھے، قدیم آرزو کی تکمیل کا سامان بھی موجود تھا، ان کے محبوب استاد شیخ تقی الدین الہلالی بغداد میں

---

(۱) چراغ راہ، مسعود عالم ندوی نمبر ص ۱۳۶

موجود تھے، جو اب ان کے تلمذ پر فخر کرتے تھے اور حلقۂ احباب میں شمار کرنے کے لیے تیار تھے۔ ۲۸/اپریل ۴۹ء سے ۱۳/دسمبر ۴۹ء تک یہ سفر ممتد رہا، جس کی مفصل روداد اور روزنامچہ "دیار عرب میں چند ماہ" میں محفوظ ہے، اور وہ ان کی جدو جہد وانہماک، جذبۂ دعوت اور ان کی ذہنی و علمی صلاحیتوں کی ناطق شہادت ہے۔ اس کتاب میں وہ بولتے ہوئے نظر آتے ہیں اور ان کے ذہن و مزاج کی پوری تصویر آگئی ہے۔ وہی صاف گوئی، وہی تلخ نوائی کہیں تنقید کی تلخی، کہیں محبت کی شیرینی اکثر و بیشتر عقل کی پاسبانی، لیکن کبھی کبھی اقبال کے اس مشورے پر عمل کہ

لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے"(۱)

۵/مئی کو مسعود صاحب بصرہ اور ۱۰ مئی کو بغداد پہنچ گئے، اور تقریباً تین ماہ بغداد میں قیام رہا۔ وہاں ہر روز ہلالی صاحب کے پاس جاتے، عربی رسائل پڑھ کر سناتے اور تحریک اسلامی کی دعوت سے متعارف کراتے، اس کے علاوہ بغداد کے دوسرے علماء اور صاحب علم حضرات کے سامنے جماعت اسلامی کی دعوت کی وضاحت کرتے، ہندوپاک کے حالات بیان کرتے۔ پھر ان علماء نے دار العروبہ کے بہت سے عربی رسالے پاکستان سے طلب کیے اور بڑی تعداد میں نوجوانوں میں تقسیم کیے، اس سفر میں مسعود صاحب کو حج کرنے کی امید نہ تھی، لیکن اللہ تعالیٰ نے حج وزیارت سے بھی مشرف کیا۔ اس سفر میں مسعود صاحب کے رفیق محمد عاصم صاحب جو تمام سفر آپ کے ساتھ رہے، لکھتے ہیں:

"بغداد کے قیام تک ہمیں یہ امید نہ تھی کہ اس سفر میں ہم لوگ حج و زیارت سے بھی شرف یاب ہو سکیں گے۔ لیکن ایک تو ہلالی صاحب نے بہت زور دیا، دوسرے جماعت نے بھی دو ہزار روپے دینے کا وعدہ کیا، اس

---

(۱) پرانے چراغ ص ۳۴۷

لیے مسعود صاحب نے عزم کیا کہ حج وزیارت سے مشرف ہو کر پاکستان واپس جائیں گے۔ مجھے بھی اپنے ساتھ رکھنے پر اصرار کیا۔ بغداد سے بصرہ اور بصرہ سے کویت پہنچے۔ وہاں گیارہ روز قیام کیا، کویت سے بار برداری کے ایک ٹرک کے ذریعے ریاض پہنچے، وہاں چند دن قیام کر کے مکہ معظمہ پہنچے، مدینہ منورہ اور جدہ میں ہمارا قیام تقریباً تین ماہ رہا، اس طرح ۱۳ر دسمبر ۴۹ کو ہم لوگ بحری جہاز کے ذریعہ واپس کراچی پہنچ گئے۔"(۱)

ممالک عربیہ کا سفر مسعود صاحب نے بڑی تمناؤں اور آرزوؤں سے کیا تھا، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے قیام کے زمانے ہی میں مسعود صاحب کا ذہن ہر وقت عالم عربی ہی کی سیر کرتا رہتا تھا۔ جیسا کہ خود مسعود صاحب لکھتے ہیں۔

"ہم دونوں (مسعود صاحب اور علی میاں صاحب) رہتے تو ہیں ہندوستان اور پاکستان میں، مگر علمی اور ادبی طور پر ہمارا طائر فکر قاہرہ اور دمشق میں پرواز کرتا رہتا تھا۔ ہم اردو ادب اور ادیبوں کی نسبت عربی ادب اور ادیبوں سے زیادہ واقفیت اور دلچسپی رکھتے ہیں۔"(۲)

اسی طرح مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں:

"ہمارا کمرہ، ہماری رہائش گاہ "الضیاء" کا دفتر اور عربی ذوق رکھنے والوں کا مرکز تھا، الضیاء کے تبادلے میں بکثرت رسائل و مجلّات آتے تھے، ان کی وجہ سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہم لکھنؤ میں نہیں بلکہ کسی عرب شہر میں ہیں۔ ہر وقت عرب ادباء و اہل قلم پر تبصرہ و تنقید اور مختلف ادبی موضوعات پر اظہار خیال اور مذاکرہ رہتا، عرب ڈاک ہاتھوں ہاتھ لی جاتی

---

(۱) چراغ راہ، مسعود عالم ندوی نمبر ص:۱۳۶

(۲) ماہنامہ فاران، فروری ۱۹۵۳ء ص: ۴۰

اور بڑے شوق سے پڑھی جاتی۔"(۱)

اس سفر کا سب سے بڑا مقصد تحریک اسلامی کی دعوت کا تعارف کرانا اور عربی ماحول کا قریب سے جائزہ لینا تھا۔ نیز دعوت کے کام کو سمجھنا اور سمجھانا تھا۔ خود مسعود صاحب کے الفاظ میں:

"اس سفر کا بڑا مقصد ہم مذاق اور ہم مشرب درد مند رفیقوں کی تلاش تھی، آثار قدیمہ اور مشہور مقامات کی زیارت کا موقع بھی بہت کم ملا۔ حرمین شریفین کے علاوہ دوسری جگہوں کی طرف تو توجہ بھی نہ کر سکا۔ ان کے بدلے درد مند نوجوانوں اور ہم مشرب اہل علم و اہل قلم سے ملنے ملانے میں زیادہ وقت صرف ہوا۔"(۲)

اس سفر کے دوران مسعود صاحب نے اہل عرب تک جس محنت اور لگن کے ساتھ تحریک اسلامی کے پیغام کو پہنچایا، وہ ان کا ایک اہم کارنامہ تھا۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ ان سے زیادہ پورے ہندوپاک میں اس کام کے لیے کوئی دوسرا شخص موزوں نہ تھا، اور اس ذمے داری کو انہوں نے بحسن و خوبی انجام دیا۔ اس سفر کی مفصل روداد ان کی کتاب "دیار عرب میں چند ماہ" میں موجود ہے۔

اس سفر کے دوران مسعود صاحب نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ دارالعروبہ کا کام مستقل طور پر دمشق یا قاہرہ میں رہ کر کیا جائے، مگر امیر جماعت اور دوسرے رفقاء سے صلاح و مشورہ کی غرض سے ۱۳ دسمبر ۴۹ء کو بحری جہاز کے ذریعے واپس کراچی آئے۔

واپسی کے بعد تین ماہ تک حیدر آباد سندھ میں آپ کا قیام رہا، کراچی کی آب و ہوا مناسب نہ ہونے کی وجہ سے آپ نے حیدر آباد ہی میں سکونت اختیار کرنے کا ارادہ کر لیا

---

(۱) پرانے چراغ ص: ۳۲۳

(۲) دیار عرب میں چند ماہ ص: ۵

تھا۔ لیکن تین ماہ کے قیام سے تجربہ ہوا کہ یہاں کی آب و ہوا بھی طبیعت کے موافق نہیں ہے، چنانچہ مارچ ۵۰ء میں گوجرانوالہ منتقل ہوگئے، یہاں آپ کا قیام تقریباً سوا سال تک رہا۔ اس دوران آپ نے اپنی کتاب "تاریخ الدعوۃ الاسلامیۃ فی الھند" کا کچھ حصہ مکمل کیا۔ طبیعت کی خرابی کی وجہ سے یہاں بھی آپ سکون و اطمینان سے کوئی خاص کام نہ کر سکے۔

امیر جماعت کے عہدے پر

۴/اکتوبر ۴۸ء سے امیر جماعت مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ اور جماعت کے دوسرے زعماء ابھی تک قید ہی میں تھے، اور جناب عبدالجبار غازی صاحب امیر جماعت کے فرائض انجام دے رہے تھے، لیکن خرابی صحت کی وجہ سے انہوں نے استعفادے دیا۔ پھر ارکان شوریٰ نے مسعود صاحب کو امیر جماعت کے عہدے کی ذمہ داری سونپی، لیکن صرف دو دن بعد مولانا مودودیؒ رہا ہوگئے، اس طرح مسعود صاحب دو دن امیر جماعت کے عہدے پر بھی رہے۔ مولانا کے خاص رفیق محمد عاصم صاحب رقم طراز ہیں:

> "مئی ۵۰ء میں جناب عبدالجبار غازی صاحب نے اپنی خرابی صحت کی بناء پر جماعت کی امارت سے استعفادے دیا۔ ارکان شوریٰ نے متفقہ طور پر مسعود صاحب کو جماعت کا امیر منتخب کرلیا، اپنی خرابی صحت کی بناء پر مسعود صاحب نے بہت معذرت کی، پھر دار العروبہ کی ذمہ داری بھی ان کے کندھوں پر تھی، لیکن رفقاء جماعت نے ان سے بہتر کوئی دوسرا آدمی امارت کے لیے موزوں نہ پایا، مجبوراً مسعود صاحب کو یہ ذمہ داری بھی قبول کرنا پڑی، گوجرانوالہ واپس آگئے اس ارادے سے کہ چند دن کے بعد مستقل طور پر لاہور منتقل ہوکر اس ذمہ داری کا باقاعدہ چارج لے لیں گے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا کرنا ایسا ہوا کہ جس دن رفقاء نے مسعود صاحب کو

امیر جماعت منتخب کیا، اس سے دو ہی روز کے بعد ملتان جیل سے مولانا مودودیؒ، مولانا اصلاحی اور میاں طفیل محمد صاحب کی رہائی ہو گئی۔ مسعود صاحب کے سر سے گویا ایک بار عظیم ٹل گیا۔"(۱)

دار العروبۃ کی راولپنڈی منتقلی

گوجرانوالہ کے قیام کے دوران مسعود صاحب کو تجربہ ہوا کہ یہاں کی آب و ہوا بھی راس نہ آئی، اکثر طبیعت خراب رہنے لگی۔ کام کرنا مشکل ہو گیا، لہذا مجبوراً راولپنڈی میں دوبارہ مستقل قیام کرنے کا فیصلہ کیا اور **دار العروبۃ** بھی یہیں منتقل ہوا۔ مئی ۵۱ء میں راولپنڈی منتقل ہو گئے، اور ایک دو ماہ کی تلاش کے بعد انہیں **دار العروبۃ** اور اپنی رہائش کے لیے مکان ملا۔

اسی زمانے میں مسعود صاحب نے اپنی کتاب "**تاریخ الدعوۃ الاسلامیہ فی الھند و باکستان**" کو جلد از جلد مکمل کرنے کی کوشش کی۔

المسلمون اور بعض دوسرے عربی پرچوں میں مضامین بھی لکھے۔ اردو رسالوں میں مضامین کا سلسلہ شروع کیا۔ اسی سال نومبر ۵۱ء میں جماعت اسلامی پاکستان کا سالانہ اجتماع ہوا، آپ نے اس کے لیے دو مقالے لکھے: ایک "دنیا میں اسلامی تحریکیں" اور دوسرا "ہندوستان میں دعوت اسلامی کی مختصر تاریخ" اور ان کو اجتماع میں پڑھ کر سنایا۔

راولپنڈی میں آپ نے **دار العروبۃ** کے تمام رسالوں کی دوبارہ تصحیح کی، ان پر مقدمے لکھے مولانا مودودیؒ کا مختصر اور جامع تعارف نامہ لکھا، محمد عاصم صاحب نے ان دنوں بہت سی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا، جیسے: دو دستوری خاکے، منشور جماعت اسلامی، انتخابی جدوجہد، تحریک اسلامی کی اخلاقی بنیادیں، سود کے بعض ابواب، مسئلہ ملکیت زمین اور دستور اسلامی کی تدوین وغیرہ۔ ان سب پر مسعود صاحب نے نظر ثانی اور تصحیح کی۔ اس کے

---

(۱) چراغ راہ، مسعود عالم ندوی نمبر ص: ۱۳۷

علاوہ اپنی کتاب ''الترجمة العربية'' از سر نو ترتیب دی۔

راہ حق میں گرفتاری پر صبر و استقامت

اگر کبھی تحریک اسلامی کے سلسلے میں کسی ابتلاء و آزمائش کا خطرہ پیدا ہو جاتا، تو مسعود صاحب برضا و رغبت اس کا خیر مقدم کرنے پر آمادہ نظر آتے، دہشت و سراسیمگی کا کیا سوال! اس نوع کا اندیشہ بھی اگر محسوس ہوتا تو یقین و ایمان میں تازگی کی لہر دوڑ جاتی، ابتلاء و آزمائش کو تحریک اسلامی کے راستے میں ہر وقت مرحبا کہنے کے لیے تیار رہتے، دوسروں کا حوصلہ بڑھاتے، ان کی ہمت بندھاتے۔ چنانچہ دار العروبۃ کے رفیق عبدالرحمان حمّاد صاحب لکھتے ہیں:

> کبھی کبھی ہم لوگ کہا کرتے تھے، کہ تحریک اسلامی جب تک مضبوط و مستحکم نہ ہو جائے، اسے سر فروش مردان کار اور جانباز مجاہدین کا رزار میسّر نہ آجائیں، خدا کرے کہ اس وقت تک کوئی ابتلاء نہ پیش آئے، اور تحریک تصادم و کش مکش سے محفوظ رہے۔ اس کے جواب میں مولانا بہت پر عزم انداز میں فرماتے:
>
> ''اگرچہ شریعت نے ابتلاء کو دعوت دینے اور آزمائش کی تمنا کرنے سے منع کیا ہے۔ لیکن تحریک اسلامی کے مفاد ہی کے پیش نظر میرا تو جی چاہتا ہے کہ یہ مرحلہ جلد ہی آجائے تو اچھا ہے کیونکہ اس سے کھرے کھوٹے میں امتیاز ہو جائے گا، کسی جگہ جمود کی ذرا بھی کیفیت پائی جاتی ہے تو وہ ختم ہو جائے گی، مفاد پرست اور ناقص الایمان افراد جو ہر تحریک کو لے ڈوبنے والے ہوتے ہیں، وہ چھٹ جائیں گے اور بے لوث کارکن عزیمت و استقامت کی دولت سے مالا مال ہو جائیں گے۔'' (۱)

---

(۱) ماہنامہ فاران، مارچ ۵۶ء ص: ۷۳

چنانچہ تقسیم ہند کے فوراً بعد ہی تحریک اسلامی ابتلاء و آزمائش کے دور میں داخل ہو گئی، اور تحریک ختم نبوت کے سلسلے میں جماعت اسلامی کے دوسرے زعماء کے ساتھ مسعود صاحب کو بھی گرفتار کیا گیا۔

۲۸/مارچ ۱۹۵۳ء کی صبح آپ کی گرفتاری عمل میں آئی، ان دنوں آپ کی طبیعت بہت خراب چل رہی تھی، اور مرض کے سخت دورے دن میں کئی کئی بار پڑتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود پوری ہمت اور حوصلے کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ ان دنوں مولانا مودودیؒ کی فرمائش پر ان کی معرکۃ الآراء کتاب "پردہ" کا ترجمہ خود کر رہے تھے، اور پہلے باب کا ترجمہ مکمل بھی کر لیا تھا کہ جیل کی آہنی سلاخوں کے پیچھے حکومت وقت نے آپ کو ڈال دیا۔ آپ کے خاص رفیق محمد عاصم صاحب جو ہر وقت آپ کی خدمت میں رہتے تھے، لکھتے ہیں۔

"جس روز مسعود صاحب کی گرفتاری ہوئی ہے، اس سے ایک ماہ پہلے سے ان کی طبیعت سخت خراب تھی، خصوصاً ۲۷ اور ۲۸ مارچ کی درمیانی رات کو تو انہیں مرض کا سخت دورہ پڑا، اور اسی لیے صبح کے وقت اپنے معمول کے خلاف بستر میں نڈھال لیٹے ہوئے تھے کہ دروازے پر پولیس والوں نے دستک دی، مسعود صاحب اسی حال میں پوری ہمت اور حوصلے کے ساتھ پولیس والوں کے ساتھ روانہ ہو گئے، جو انہیں ایک جیپ کار میں بٹھا کر تھانے لے آئے، یہیں غازی صاحب بھی موجود تھے، گیارہ بجے دوپہر جیل میں داخل ہوئے۔ (۱)

مسعود صاحب تقریباً چار ماہ جیل کی آہنی سلاخوں کے پیچھے رہے، اگرچہ آپ کی صحت ٹھیک نہ تھی، اور کھانے پینے اور سونے کی جو راحتیں گھر میں تھیں، وہ سب کی سب چھن گئی تھیں۔ لیکن اس کے باوجود آپ نے جس ہمت و جوانمردی اور صبر و استقامت کے

---

(۱) چراغ راہ۔ مسعود عالم ندوی، نمبر ص:۱۳۸

ساتھ جیل کی صعوبتوں کو برداشت کیا، وہ دوسروں کے لیے ایک مثال ہے۔ اس بارے میں محمد عاصم صاحب رقم طراز ہیں:

"ان چار مہینوں میں قید و بند کی آزمائشوں کو انہوں نے جس خندہ پیشانی، ہمت و جوانمردی سے برداشت کیا، وہ اپنی مثال آپ ہے، اس ہمت و جوانمردی میں نہ صرف یہ کہ وہ دوسروں سے کم نہیں تھے، بلکہ بہتوں سے آگے تھے، پلنگ کے بغیر غیر ہموار اور مرطوب زمین پر بستر بچھا کر سونا، سونے اور آرام کرنے میں جو آسانیاں انہیں فراہم تھیں وہ سب کی سب ان سے اسی روز چھن گئیں، جس روز وہ جیل میں داخل ہوئے، جیل ہی کے زمانے میں رمضان کا مہینہ آیا، گرمی انتہائی سخت تھی اور مسعود صاحب دمہ کے مریض۔ اس لیے اگرچہ روزہ کوئی نہ رکھ سکے، لیکن قرآن کی تلاوت اور رات کے قیام میں کسی صحت مند انسان سے پیچھے نہ رہے، ہر نماز جماعت سے ادا کرتے، جیل میں جو حافظ صاحب تراویح پڑھاتے تھے، وہ پانچ پارے روز پڑھتے تھے، مسعود صاحب ان ہی کے پیچھے نماز پڑھتے اور اکثر کھڑے ہو کر پڑھتے۔"(۱)

دارورسن کا کوئی مرحلہ، ابتلاء و آزمائش کی کوئی صورت مسعود صاحب کے پائے ثبات اور مومنامہ عزم اور جذبہ جہاد میں تزلزل نہ آنے دیتی، بلکہ آزمائش ان کے عزم جواں کے لیے مہمیز اور ان کے شوق شہادت کے لیے تازیانہ توانائی ثابت ہوئیں، اور جب کبھی دارورسن کا مرحلہ آتا، اور حق و باطل میں کش مکش ہوتی، تو اَلسِّجْنُ اَحَبُّ اِلَيَّ مِمَّا يَدْعُوْنَنِيْ اِلَيْهِ (یوسف بولا: قید خانہ مجھے اس سے زیادہ عزیز ہے جس کی طرف مجھے بلاتی ہو۔ یوسف: ۳۳) کی عملی تصویر پیش کرتے۔ مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں:

---

(۱) چراغ راہ۔ مسعود عالم ندوی ص: ۱۳۹

"تحریک ختم نبوت کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے ان کو بھی نوازا اور اس زار و نزار مریض کو جس کو ہمیشہ راحت و احتیاط کی ضرورت رہتی تھی، راولپنڈی جیل میں اسیری اور نظر بندی کے دن گزارنے پڑے۔ مسعود صاحب کی اس سعادت پر بڑا رشک آیا، ان کے علمی فضائل و کمالات کا اعتراف ہمیشہ سے تھا۔ لیکن اس موقع پر دل نے ان کی سبقت و فضیلت اور اپنی پسماندگی کا صاف اعتراف کیا۔"(۱)

جیل کے زمانے میں مولانا مسعود عالم صاحب کی طبیعت اگرچہ اچھی رہی مگر وہ اپنے روزناپچے کے علاوہ کوئی علمی چیز نہ لکھ سکے۔ اس کا کچھ حصہ ماہنامہ فاران، اکتوبر ۵۳ء میں شائع ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ احادیث، تفسیر اور بعض ادبی کتابوں کا مطالعہ کیا، قرآن شریف کی تلاوت روزانہ کا معمول تھا، جیل سے رہا ہونے کے بعد طبیعت بہت خراب ہو گئی، اور مرض کے ایسے ایسے دورے پڑنے لگے کہ عمر بھر ایسے دورے کبھی نہ پڑے تھے۔ چار مہینے کی اسیری کے بعد جمعہ ۲/اگست ۵۳ء کو جب رہا ہوئے تو مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی کے خط کا ایسا جواب لکھا کہ بقول مولانا علی میاں ندوی کہ وہ ان کے صحیفۂ اعمال میں انشاء اللہ ہمیشہ درخشاں رہے گا، اور کیا عجب ہے کہ وہ میزان قیامت میں بھی وزنی ثابت ہو، لکھتے ہیں:

"آپ کے عنایت نامے رہائی کے بعد نظر سے گزرے...... شکریہ! کیا گرفتاری کیا رہائی؟ سیرت نگاری کرتا رہا، مولوی جعفر تھانیسری اور مولانا یحییٰ علی کی مشقتوں کے مقابلے میں یہ میٹھی میٹھی اور بی کلاس کی آزمائشیں کس شمار میں ہیں؟ حاشا! کہ ابتلاء کو دعوت نہیں دیتا، اور نہ اس مریض ناتواں میں برداشت کی طاقت ہے۔ پر یہ مہمانی بچی نہیں، بس سیاسی زبان میں زیارت (یاترا) ہو گئی جھجک تو الحمد للہ کبھی نہ تھی، اور کچھ چھپی چھپائی ہو گی تو وہ بھی دور ہو گئی۔"(۲)

---

(۱) پرانے چراغ ص: ۳۵۳

(۲) ایضاً ص: ۳۵۴

سفر آخرت

چار سوا چار مہینے کی رہائی کے بعد مسعود صاحب کی طبیعت پہلے سے زیادہ خراب رہنے لگی، اور مرض کے ایسے ایسے دورے پڑنے لگے کہ ایسے دورے کبھی نہ پڑے تھے کئی کئی گھنٹے مسلسل بے ہوش رہنے لگے، اور حقیقت یہ ہے کہ جیل سے رہا ہونے کے بعد ان کی طبیعت پوری طرح کبھی نہ سنبھلی، یہ ان کی ہمت ہی تھی کہ کچھ نہ کچھ کام کرتے رہے ورنہ وہ اس قدر ضعیف ہو چکے تھے، کہ چلنا بھی دشوار ہوتا تھا۔ ۲۲ر نومبر ۵۳ء کو جب وہ سخت بیمار چل رہے تھے، انہیں اپنے استاد علامہ سیّد سلیمان ندوی کے انتقال کی خبر ملی۔ اس خبر سے ان کے دل کو سخت صدمہ پہنچا، محمد عاصم صاحب لکھتے ہیں:

> "بیماری سے سنبھلتے ہی تین کام انجام دیے، ایک سیّد صاحب کی وفات پر اپنے ذاتی تاثرات قلم بند کیے، جو چراغ راہ، ماہ اپریل ۵۴ء میں شائع ہوئے، دوسرے سیّد صاحب کی سوانح عمری مرتب کی، جو معارف کے "سیّد سلیمان نمبر" کے لیے اعظم گڑھ روانہ کی، تیسرے گزشتہ پچیس چھبیس سال کے عرصے میں سیّد صاحب کے جو خطوط ان کے نام موصول ہوئے تھے، اور جنہیں انہوں نے حد درجہ احتیاط اور ترتیب کے ساتھ محفوظ کر رکھا تھا، ان کے کتابی شکل میں شائع ہونے کا نظم کیا، جب مسودہ تیار ہو گیا، تو کتاب کا مقدمہ لکھا، لیکن افسوس! یہ کتاب آپ کی زندگی میں زیور طباعت سے آراستہ نہ ہو سکی، انڈکس بھی آپ کے بعد ہی مرتب ہوا۔"(۱)

یکم مارچ ۵۴ء کو مسعود صاحب اس ارادے سے کراچی روانہ ہوئے کہ اپنے پاسپورٹ کی تجدید کرائیں گے، پھر اگر جماعت نے اجازت دی، تو مصر و شام کے دورے پر روانہ ہو جائیں گے۔ کراچی میں جماعت اسلامی کی مرکزی مجلس شوریٰ کا اجلاس بھی تھا، اس

---

(۱) چراغ راہ، مسعود عالم ندوی نمبر ص: ۱۳۹

میں بھی شرکت کرنا تھی، اسی شوریٰ میں آپ کے سفر پر روانہ ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ بھی ہونا تھا لیکن کسی کو کیا معلوم تھا کہ کون سا سفر در پیش ہے، ۱۴/ مارچ سے مرکزی مجلس شوریٰ کا اجلاس شروع ہوا، مسعود صاحب اس میں شریک بھی ہوئے، لیکن ۱۶/ مارچ کو طبیعت بگڑ گئی، اور اسی دن شام کو جان جان آفریں کے حوالے کر دی، انا للہ و انا الیہ راجعون، اس آخری بیماری کا ذکر کرتے ہوئے محمد عاصم صاحب لکھتے ہیں:

> "تین دن تک شوریٰ کی کارروائیوں میں باقاعدہ حصہ لیتے رہے۔ ۱۶/ مارچ کی شام کو مغرب کے بعد مالیاتی کمیٹی کی ایک میٹنگ تھی، مسعود صاحب بھی اس کے ایک رکن تھے، مغرب کے بعد دوسرے ارکان نے آپ کو بلایا۔ مگر آپ نے یہ کہہ کر معذرت کر دی کہ آج بہت تکان محسوس کر رہا ہوں۔ اس لیے مجھے کمیٹی کی میٹنگ میں شرکت سے معذور سمجھا جائے، تاکہ کل صبح شوریٰ کی کارروائی میں پورے سکون سے حصہ لے سکوں۔ اس کے بعد اپنے بعض دوستوں سے اپنے بستر میں بیٹھے ہوئے بے تکلفی سے باتیں کرتے رہے، تقریباً ساڑھے آٹھ بجے کے قریب آپ کو مرض کا ایک دورہ پڑا، جو دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ معمول سے کافی سخت تھا، نو بجے کے قریب کسی کی مدد یا سہارے کے بغیر بیت الخلاء گئے، واپس آکر بستر پر لیٹ گئے، طبیعت بہت زیادہ نڈھال محسوس ہو رہی تھی، معمول کے بالکل خلاف یکے بعد دیگرے تین ہچکیاں آئیں، جن میں سے ہر ایک جسم کی طاقت کو کم سے کمتر ہی کرتی گئی، ڈاکٹر کو بلایا گیا، لیکن ڈاکٹر کے پہنچنے سے پہلے اللہ کا یہ مجاہد بندہ اپنے رب کو لبیک کہہ چکا تھا، انا للہ و انا الیہ راجعون، ۱۷/ مارچ کی صبح ۱۰/ بجے کے قریب پنجابی سوداگران کے قبرستان میں آپ کو سپرد خاک کیا گیا۔"(۱)

---

(۱) چراغ راہ، مسعود عالم ندوی نمبر ص: ۱۴۰

آپ اسی جگہ آسودۂ خاک ہوئے، جہاں کچھ عرصہ قبل ان کے محبوب استاد علامہ سیّد سلیمان ندوی نے داعی اجل کو لبیک کہا تھا، یہ کمال ارتباط اور تعلق خاطر نہیں تو اور کیا چیز ہے کہ استاد شاگرد دونوں کا مولد ایک ہی صوبہ بہار اور مدفن بھی ایک ہی شہر کراچی بنا۔

مسعود صاحب کی موت ایک قابل رشک موت ہے، اس لیے کہ آپ نے خدمت دین اور عالم اسلام کو اس کا بھولا ہوا سبق یاد دلانے کی خاطر گھر بار کو خیر باد کیا، ملازمت ترک کی، والدین اور اہل وعیال کی جدائی کو برداشت کیا، عیش وراحت سب کچھ اس راہ میں قربان کیا، اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید ہے کہ وہ اپنے بندۂ مخلص کو اجر شہادت عطا کرے۔ آمین!

●●

باب دوم

مولانا مسعود عالم ندوی

ایک بلند پایہ عربی ادیب

ہندوستان میں عربی زبان وادب کا تاریخی پس منظر

مولانا مسعود عالم ندوی۔ایک بلند پایہ عربی ادیب

مولانا مسعود عالم ندوی بلاشبہ ایک بلند پایہ عربی ادیب تھے۔ان کے ادبی مقام کو سمجھنے کے لیے چند تمہیدی احوال کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں عربی زبان و ادب کے تاریخی پس منظر کو بھی مدنظر رکھنا ہوگا۔اس کے بغیر صحیح طور سے ہم ان کی ادبی خدمات کو سمجھنے سے قاصر رہیں گے اور عربی کے اس ہندوستانی انشاءپرداز کے مقام ومرتبے کو متعین کرنے میں دشواری پیش آئے گی۔

برصغیر عربی زبان سے ابتداءً اس وقت آشنا ہوا۔جب عرب تاجروں نے یہاں کے ساحلی علاقوں میں تجارت کی غرض سے آمدورفت شروع کی،اور یہاں کے لوگوں سے میل جول بڑھایا،عربوں کے اخلاق وعادات سے یہاں کے لوگ نہ صرف متاثر ہوئے بلکہ ان کی زبان کی چاشنی نے بھی عربوں کی طرف متوجہ ہونے پر مجبور کیا،جب پہلی صدی ہجری کے آخر میں سندھ پر عربوں نے حملہ کیا،تو شمال مغربی ہند کے اس مفتوحہ علاقے میں بھی عربی زبان کا رواج شروع ہوا،لیکن عرب فاتحین کے جلد واپس لوٹ جانے کے باعث یہ اثر زیادہ دوررس ثابت نہ ہوا،اور یہاں وہ حالت قائم نہ ہو سکی،جو عرب فاتحین کی وجہ سے افریقہ اور یورپ میں ہوئی تھی کہ وہاں کی زبان ہی بدل گئی اور پورے ملک میں عربی ہی عوام وخواص کی زبان بن گئی۔یہاں صرف انہی علاقوں نے عربی زبان کا اثر قبول کیا

جنہیں عربوں سے کسی طور سابقہ پیش آیا، اور وہ بھی صرف اس حد تک کہ ان زبانوں میں عربی کے متعدد الفاظ کا رواج عام ہوا، اور یہ عربی رسم الخط میں لکھی جانے لگیں، سندھی زبان میں دوسری علاقائی زبانوں کی نسبت اسی وجہ سے عربی الفاظ کی کثرت ہے اور سندھی کا رسم الخط بھی خالص عربی نسخ کا ہے۔

ہندوستان میں عربوں کے مختصر قیام کی وجہ سے دوسری صدی ہجری کے آغاز سے لے کر تیرھویں صدی ہجری کے اواخر تک معدودے چند کو چھوڑ کر کوئی ایک ادیب اور انشاء پرداز پیدا نہ ہو سکا اور ان میں بھی اکثر وہ لوگ تھے جنہوں نے ترک سکونت اختیار کر کے عرب ہی میں سکونت اختیار کی تھی اور وہیں ان کی ادبی صلاحیتیں بھی اجاگر ہوئیں، یا پھر انہوں نے اپنی زندگی کا اکثر حصہ دیار عرب میں گزارا۔

عربی کے مشہور ادیب اور تاج العروس کے مصنف مرتضٰی زبیدی بلگرامی اگرچہ ہندی الاصل تھے لیکن یہاں سے ہجرت کر کے عرب چلے گئے، قاہرہ میں ان کا انتقال ہوا۔

اس ملک میں عربی علوم وادب کی ترویج کے تاریخی پس منظر کو مزید سمجھنے کے لیے ہمیں مولانا عبدالرحمان الکاشغری الندوی کے عربی دیوان "الزھرات" کے مقدمے میں مولانا مسعود عالم ندوی ہی کے قلم سے چند سطریں ملتی ہیں، اس مقدمے سے اس ملک میں عربی زبان وادب کا تاریخی پس منظر خاص کر واضح ہو جاتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے خود لکھا:

"ہمارا ملک (برصغیر ہند وپاک) ان خوش نصیب ملکوں میں ہے جہاں عرب تاجروں اور مجاہدوں کے قدم آچکے ہیں، اگرچہ وہ زیادہ دنوں قیام نہ کر سکے اور آخر کار ان کی آمد ورفت کا سلسلہ ہی منقطع ہو گیا، اسی لیے عربی زبان یہاں وہ فروغ حاصل نہ کر سکی جس کے ہم متمنی تھے، ہاں چند شاعر عربی کے ضرور پیدا ہو گئے جن کی پختہ کلامی اور عربی ذوق کی صحت سے انکار نہیں، لیکن یہ حال سندھ کا ہے جہاں عربوں کی آمد ورفت رہی

تھی، سندھ کے علاوہ ملک کے دوسرے حصے جہاں عرب مجاہدین آئے ہی نہیں بلکہ مغلوں، ترکوں اور افغانیوں کی جماعتیں آتی رہی ہیں، وہاں قرآن کریم کی زبان جس کسمپرسی میں رہی اور جس درجہ اس کی مٹی پلید ہوئی اور جس قدر فارسیت کا غلبہ رہا، اس کا ذکر ہی فضول ہے۔ رہے وہ حضرات جو زمانے کی ناسازگاریوں کے باوجود عربیت کو سینوں سے لگائے رہے اور اس کے درس و تدریس میں مشغول رہے، انہوں نے اگر کبھی عربی میں کچھ لکھا لکھایا، تو ان کی تحریریں حافظ ابراہیم کے ان دو شعروں کا مصداق تھیں۔

سرت لوثة الاعجام فيها كما ترى
لعاب الأفاعی فی سبيل فرات
فجاءت كثوب ضم سبعين رقعة
مشكلة الالوان مختلفات (۱)

چند ماہرین فن کو چھوڑ کر جنھوں نے زبان و ادب کو صحیح طریقے پر حاصل کیا، کسی کو بھی اس عموم سے مستثنیٰ نہیں کیا جاسکتا۔ صحیح طریقہ اختیار کرنے والے وہ لوگ ہیں جنھوں نے عرب ممالک کا سفر کیا، اور زبان و ادب میں کامل دستگاہ حاصل کی، ان لوگوں میں عربیت کا پایہ بہت بلند ہے۔ جیسے: شاہ ولی اللہ اور سید تقی زبیدی یا ان کی طرح اگر کسی اور نے یہ کمال حاصل کیا ہو۔"(۲)

آٹھویں صدی ہجری سے لے کر بارہویں صدی ہجری کے اواخر تک کا زمانہ خود

(۱) ترجمہ: عربی زبان میں عجمیوں کی ژولیدہ بیانی اس طرح سرایت کر گئی، جیسے نہر فرات کے بہاؤ میں اژدہوں کے زہر پھیل جائیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی تحریریں ایسے کپڑوں کی طرح ہو گئیں جن میں لاتعداد رنگ برنگ کے پیوند لگے ہوں۔

(۲) الزھرات ص: ۹۰ بحوالہ چراغ راہ مسعود عالم ندوی نمبر ص: ۱۶۸

عرب ممالک میں عربی زبان وادب کے اعتبار سے تاریک تھا، پورے عالم عرب پر ظلمت کا سایہ تھا، زبان وادب کا انحطاط تھا، جس سرزمین نے ایک ڈیڑھ صدی کے عرصہ میں عربی زبان وادب کے بڑے بڑے مصنفین اور نقاد پیدا کیے اور جن کا نام آج بھی روشن ہے، جنھوں نے عربی زبان وادب کو انتہائی عروج تک پہنچایا۔ افسوس! کہ اس سرزمین سے اس کے بعد پانچ سو سال کے طویل عرصے میں سوائے ابن خلدون کے کوئی قابل ذکر ادیب پیدا نہ ہوا۔

عالم عرب اسی جمود اور ظلمت کے دور سے گزر رہا تھا کہ تیرھویں صدی ہجری کے آغاز میں یورپ نے اپنے زبردست حملوں سے عربی ممالک کو نیند سے بیدار کیا، ان کو جھنجھوڑ کے رکھ دیا، اس وقت یکایک عربوں کو احساس ہوا کہ وہی یورپ جس کو انہوں نے آج سے چار سو برس قبل علم وحکمت کی روشنی عطا کی تھی۔ اب جدید علوم وفنون سے مسلح ہو کر سامنے کھڑا للکار رہا ہے، چنانچہ اس انقلاب کو دیکھتے ہوئے اہل عرب نے تعلیم کو فروغ دینے کی زبردست کوشش شروع کی۔ اس زمانے میں مصر کو محمد علی جیسا منتظم اور سربراہ میسر آگیا۔ اس نے صرف ملکی تعلیم وتربیت پر ہی اکتفاء نہ کیا بلکہ مصری نوجوانوں کو اعلیٰ تعلیم کے حصول کی خاطر لندن اور پیرس کی یونیورسٹیوں میں بھیجا، نتیجہ یہ ہوا کہ عربی زبان وادب میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی۔

انیسویں صدی عیسوی میں عرب ممالک میں عربی زبان و ادب کو کافی فروغ حاصل ہوا، بلکہ یہ عربی زبان اور اس کے آداب وفنون کی نشاۃ ثانیہ کا زمانہ تھا۔ اس صدی میں زبان وادب کی تجدید شروع ہوئی، اور بیسویں صدی کے نصف تک پہنچتے پہنچتے نقطۂ کمال کو جا پہنچی۔ اس طویل عرصے میں عربی کے بے شمار ادباء، انشاء پرداز، مصنفین، صحافی، شاعر اور نقاد پیدا ہوئے، جنھوں نے اپنی علمی وفکری کاوشوں سے عربی زبان کے علم وادب میں بہت بیش قیمت اضافے کیے۔ ان کے سرخیل عالم اسلام کے مشہور رہنما اور اتحاد بین المسلمین کے داعی جمال الدین افغانی تھے، جنھوں نے اپنی پر اثر شخصیت، بلندی فکر اور قوت عزم سے عربوں کو نیند سے بیدار کیا، ان کے اندر نیا جوش وولولہ پیدا کیا، وہ افغانی ہونے کے

باوجود عربی زبان کے ایک باکمال انشاء پرداز تھے، مصر میں آٹھ سال رہنے کے بعد جب انہیں وہاں سے نکالا گیا، تو پیرس میں انہوں نے اپنے شاگرد خاص مفتی محمد عبدہ کے ساتھ مل کر ایک عربی رسالہ "العروۃ الوثقیٰ" کے نام سے جاری کیا، جو اپنے زور بیان میں ضرب المثل تھا۔

مفتی محمد عبدہ نے علمی اور تعلیمی حلقوں میں اپنے اعلیٰ فکر سے ایک انقلاب پیدا کیا اور عربی زبان کی اصلاح و ترقی میں بھی ایک مجدّدانہ کارنامہ انجام دیا، پھر مفتی محمد عبدہ کے شاگردوں اور جانشینوں کا ایک سلسلہ چلا، ایک کثیر تعداد نے ان کی صحبت سے فائدہ اٹھایا، ان کی علمی اور ادبی خصوصیات کو اپنے اندر جذب کر لیا، ان میں سے چار کا نام سرفہرست ہے: ایک مصر کے مشہور عالم، مفسر اور ادیب سیّد رشید رضا، دوسرے اپنے وقت کے سب سے بڑے شامی نثر نگار امیر شکیب ارسلان، تیسرے شام کے مقالہ نویس عبدالقادر المغربی اور چوتھے مصطفیٰ صادق الرافعی۔

اس طرح ایسے ادباء کا ایک سلسلہ چل پڑا، جن کی ادبی تحریریں کسی دوسری صدی کے مصنفین اور ادباء سے معیار میں کم نہیں تھیں، جہاں جہاں "العروۃ الوثقیٰ" پہنچا، وہاں ان حضرات کا اسلوب نگارش بھی پہنچا۔ پھر اس حلقے کے بیشتر افراد صرف ادیب اور شاعر یا محض صحافی ہی نہ تھے، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ دین اور شریعت پر ان کی گہری نظر بھی تھی۔ آج ہندوستان میں کتنے ہی حضرات ایسے ہوں گے جو سیّد رشید رضا کو صرف ایک مفسر قرآن کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ ہندوستان اور عرب کے درمیان جب باہمی روابط پیدا ہوئے اور کتب و رسائل کا تبادلہ ہونے لگا، تو عرب ادباء اور اہل قلم کے اس گروہ کی علمی کاوشیں اور افکار ہندوستان میں زیادہ عام ہوئے اور انہی حضرات کی تحریریں زیادہ مقبول ہوئیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں متقدمین میں مولانا شبلی نعمانی، مولانا عبدالحمید فراہی (۱) اور عبدالحیؒ لکھنوی وغیرہ اور متاخرین میں علامہ سیّد سلیمان ندوی، علامہ عبدالعزیز میمنی،

(۱) اردو میں عبدالحمید فراہی لکھا جاتا ہے۔

مولانا عبد الرحمان کاشغری اور ندوۃ العلماء کے دوسرے اساتذہ پر عربی ادب و انشاء کے اسی حلقہ کا پرتو پڑا، ان سب کے کلام میں جو چیز مشترک نظر آتی ہے وہ سادگی اور وضاحت پسندی ہے، ان کی ضخیم اور اہم تصنیفوں سے لے کر چھوٹے چھوٹے مقالوں تک میں ہمیں کہیں عبارت میں کوئی کجی، ترکیب میں کوئی پیچیدگی اور معانی میں کوئی تعقید کا پہلو نظر نہیں آتا، اس کے علاوہ اسلام پسندی اور شریعت الٰہی سے بے پناہ وابستگی ان کے کلام میں روح کی طرح جاری و ساری نظر آتی ہے۔

مسعود عالم ندوی اور عربی زبان وادب

مذکورہ بالا علمی ماحول میں مسعود صاحب نے عربی زبان وادب کی تکمیل کی، ان ادیبوں کی تصنیفات نے آپ کے عربی زبان وادب کے ذوق کی نمو میں اہم کردار ادا کیا۔ اپنے اساتذہ کی طرح آپ نے بھی ان خصوصیات کو اپنے اندر جذب کرلیا، اور عربی ادب و انشاء میں وہ قدرت حاصل کی جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے نیز آپ کے فطری ذوق اور وہبی صلاحیتوں نے عربی ادب کے فن کو مزید نکھارا، قدیم مآخذ کے گہرے مطالعے اور جدید لٹریچر اور خاص کر امیر شکیب ارسلان، سیّد رشید رضا کی تصنیفات سے براہ راست استفادہ نے آپ کے عربی ادب کو ایک صحیح اور معتدل، نیز سلاست اور روانی سے بھرپور اسلوب مہیا کیا، لیکن جس چیز نے آپ کے فن اور ہنر کو زیادہ نکھارا، فصاحت و بلاغت کا بے مثال جوہر پیدا کیا وہ ڈاکٹر تقی الدین ہلالی کا فیض صحبت اور ان سے استفادہ تھا، اسی فیض کے نتیجے میں آپ نے عرب کے ممتاز ادباء کے درمیان جگہ پائی۔

ڈاکٹر صاحب میں عربی زبان کی قدرت اور اسلوب بیان کی بیشتر صفات بدرجۂ اتم موجود تھیں، انشاء و تحریر کا جو انداز تھا وہی ان کی عام گفتگو اور کلام کا بھی انداز تھا، نیز وہ عربی زبان و ادب اور صرف و نحو میں سند کا درجہ رکھتے تھے۔ مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی اس سلسلے میں رقم طراز ہیں:

"موصوف (ڈاکٹر تقی الدین ہلالی) عالم عربی کے ممتاز ترین محقق وادیب اور صرف ونحو میں سند وحجت کا درجہ رکھتے تھے، ان کی بول چال اور عام تحریر کی زبان پوری عربی دنیا میں اپنی صحت، سلاست، برجستگی اور عربی محاورات میں بے نظیر ہے۔"(۱)

چنانچہ مسعود صاحب نے ڈاکٹر صاحب کی صحبت ومعیت سے خوب خوب فائدہ اٹھایا، اور ان کی تربیت نے ہی آپ کی عربی انشاء کا ایک خاص طرز پیدا کیا، یعنی اپنے اسلوب میں ایسی انفرادیت اور خصوصیت پیدا کی جو شاذ ونادر ہی کسی اہل قلم میں نظر آتی ہے۔

مسعود صاحب کا نحو وصرف میں بھی ایک ممتاز مقام ہے، جس کی واضح مثال آپ کی کتاب "الترجمة العربية" ہے، جو آپ نے ابتدائی عربی سیکھنے والوں کے لیے مرتب کی ہے۔ اس کے علاوہ قدیم مآخذ ادبیہ میں کوئی ایسا مآخذ شاید ہی ہو، جس سے آپ نے براہ راست استفادہ نہ کیا ہو، یہی وجہ ہے کہ آپ کی تحریروں میں برجستگی وسلاست اور روانی کے ساتھ ساتھ قدیم محاورات اور ترکیبیں بکثرت ملتی ہیں۔ مسعود صاحب نے اپنی حیات میں عربی زبان میں بہت کچھ لکھا ہے، آپ نے مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی بہت سی کتابوں کا ترجمہ بھی عربی میں کیا، اور "الضیاء" کی ادارت انجام دی، عربی میں بہت سارے مضامین لکھے، جو عرب ممالک کے مؤقر رسالوں میں شائع ہو کر داد وتحسین حاصل کر چکے ہیں۔

---

(۱) پرانے چراغ ص: ۳۲۰

عربی ادب میں مسعود عالم ندوی کی خدمات

ان کی ابتدائی عربی و علمی خدمات کو سامنے رکھ کر چار ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

پہلا دور (۱۹۲۹ تا ۱۹۳۲ء)

اس کے زمانے میں جہاں آپ ندوۃ العلماء کے علمی و ادبی ماحول میں رہ کر سیّد سلیمان ندوی کی سرپرستی میں عربی ادب کی تکمیل کر رہے تھے، وہیں آپ کے مضامین مصری مجلّہ ''الزہراء'' جیسے عربی کے بلندپایہ رسالوں میں چھپتے تھے، نیز عربی رسائل و مجلّات جو دارالمطالعہ میں آتے تھے، وہ آپ کے زیر مطالعہ میں رہتے۔ نتیجۃً آپ کا اوڑھنا بچھونا عربی زبان و ادب ہو گیا تو آپ نے عربی کا ایک قلمی رسالہ ''القائد'' جاری کیا۔ اس کے متعلق مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں:

> ''اس کے مضمون نگاروں کے لیے یہ شرط تھی کہ وہ اپنے مضامین خود اپنے قلم سے لکھ کر شامل کریں، رسالے کے ممتاز مضمون نگاروں نے ہونہار ایڈیٹر کے علاوہ مولانا عبدالرحمٰن کاشغری(۱) ندوی، مولانا محمد نظام ندوی

---

(۱) مولانا عبدالرحمٰن کاشغری ندوی عربی کے قادرالکلام شاعر تھے، لغت پر ان کی بڑی اچھی نظر تھی، وہ شیر بنگال مولوی فضل الحق صاحب کی دعوت پر جو اس وقت بنگال کے وزیر اعلیٰ تھے، مدرسہ عالیہ منتقل ہو گئے تھے، تقسیم ملک کے بعد وہ مدرسہ عالیہ ڈھاکہ منتقل ہو گئے، اور اخیر تک وہیں رہے ۱۹۷۱ء کے شروع میں ڈھاکہ میں مولانا نے انتقال کیا، ان کے اشعار کا مجموعہ ''الزہرات'' (جس پر مولانا مسعود عالم ندوی نے مبسوط مقدمہ لکھا ہے) اور ''امثال اللغتین'' کے سلسلۂ مضامین جس میں انہوں نے عربی اردو کے ہم معنی ضرب الامثال جمع کیے ہیں، ان کی علمی یادگاریں ہیں، غفر اللہ لہ۔

(سابق شیخ الجامعه العباسیه بہاولپور) اور جوان مرگ ادیب ابو یوسف بہاری مرحوم تھے، اس رسالے کے شمارے ابھی تک طلبہ کی انجمن میں محفوظ ہیں، ان کو دیکھ کر آج بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اس قلمی رسالے کا نوعمر مدیر ایک دن ملک کا بہت بڑا ادیب اور پختہ کار صحافی بنے گا۔"(۱)

اسی زمانے میں عربی ادب کے تکمیل کے پیش نظر آپ نے ایک اہم مطالعہ "تاثیر الاسلام فی الشعر العربی" لکھا جو بعد میں قسط وار "الضیاء" میں شائع ہوا۔

دوسرا دور (۱۹۳۲ تا ۱۹۳۵ء)

اس عرصے میں آپ نے چار سال تک عربی کا ماہوار رسالہ "الضیاء" اپنی ادارت میں بڑی محنت و لگن سے نکالا جو بہت مقبول ہوا۔ اس زمانے میں ڈاکٹر تقی الدین ہلالی ندوہ میں موجود تھے، ان ہی کی رہنمائی اور سرپرستی میں آپ اپنے مضامین اور شذرات لکھتے اور ان کو سناتے، اور ان کی اصلاح قبول کرتے، اس تربیت سے آپ کی زبان میں پختگی آئی، اور اس طرح ان کا عربی کا ایک خاص اور منفرد اسلوب دنیا میں شہرت پذیر ہو گیا۔

تیسرا دور (۱۹۳۵ تا ۱۹۴۴ء)

آپ نے پٹنہ کی خدا بخش اورینٹل لائبریری میں بحیثیت کیٹلاگر گزارا۔ اور اسی زمانے میں آپ نے مصر کے مشہور صحافی محبّ الدین الخطیب کی خواہش پر ہندوستان کی تاریخ عربی زبان میں "تاریخ الدعوة الاسلامیة فی الهند" کے عنوان سے لکھنا شروع کی۔ جس کا خلاصہ بعد میں "نظرة اجمالیة فی تاریخ الدعوة الاسلامیة فی الهند و باکستان" کے نام سے مصر سے شائع ہوا اس کے علاوہ قیام پٹنہ کے دوران آپ نے متعدد

(۱) پرانے چراغ ص: ۳۱۸

عربی اور اردو مضامین بھی لکھے جو وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے۔

چوتھا دور (۱۹۴۴ء سے لے کر آخری وقت تک)

آپ جماعت اسلامی کے رکن رہے اور جماعت کے زعماء میں آپ کا شمار ہونے لگا تو دیگر تصنیف و تالیف اور مضمون نگاری ترک کر کے آپ جماعت اسلامی اور خاص کر مولانا مودودیؒ کی کتابوں کے ترجمے میں ہمہ تن مشغول ہوگئے، آپ کے یہ تمام تراجم ایک علمی شاہکار ہیں، جو تاقیامت خلق کے لیے نافع ہیں۔ اخیر زمانے میں آپ نے مصر کے عربی رسالوں المسلمون، الدعوۃ، منبر الشرق وغیرہ میں کچھ علمی مضامین بھی لکھے، یہ مضامین بہت سنجیدہ، لطیف اور سہل ہیں اور ہر ایک میں آپ کے منفرد اسلوب کا حسن ہے۔

عربی طرز نگارش کا تعارف

مولانا مسعود عالم ندوی کا اسلوب بالکل سادہ تھا، عبارت میں کوئی ٹیڑھ، نہ ترکیب میں کسی پیچیدگی کا گمان ہوتا ہے، اور معانی میں کوئی ابہام بھی نہیں ہوتا بلکہ برجستگی اور سلاست و روانی ہوتی ہے۔ آپ عصر اول کے اسلوب و محاورات میں جدید خیالات اور جدید فکر کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ جمع کر دیتے، اس کے ساتھ ساتھ صحت زبان اور فصاحت کلام میں آبشاروں کی سی روانی اور موج دریا کا سا بہاؤ نظر آتا ہے۔ بے فائدہ جملوں، غریب اور مشکل الفاظ، پیچیدہ تراکیب اور طوالت سے آپ کا اسلوب بالکل پاک نظر آتا ہے۔

مولانا محمد کاظم سباق اس سلسلہ میں لکھتے ہیں:

> ”ان کے (مسعود عالم ندوی) اسلوب کی پہلی صفت تھی، زبان کی صحت، محاورات کا صحیح استعمال، فصیح الفاظ کا انتخاب اور بلیغ تراکیب سے عبارت کی آرائش، زبان و محاورہ کے معاملے میں وہ تقویٰ کے اس اعلیٰ مقام پر فائز تھے جہاں ایک مشتبہ اور مشکوک چیز کا استعمال بھی حرام سمجھا جاتا ہے۔ جس لفظ یا ترکیب میں ذرا بھی شک ہوتا اسے استعمال نہیں کرتے تھے۔

اور اس کے بجائے ایسا لفظ یا ترکیب لے آتے، جس کی فصاحت کا یقین ہو، ایک دفعہ اپنے ایک شاگرد سے کہنے لگے کہ اگر زبان دانی میں کوئی مقام حاصل کرنا ہے تو یہ اصول بنالو کہ جس لفظ و ترکیب کی صحت کا یقین کامل حاصل نہ ہو، اس میں ہمیشہ شک کرو اور بغیر تحقیق کیے اسے کبھی استعمال نہ کرو۔ حد یہ تھی کہ جب اپنے تلامذہ کے مضامین اور ترجموں کی اصلاح بھی کرنے بیٹھتے تو سب سے پہلے قاموس، اساس البلاغة، المصباح المنیر اور مختار الصحاح وغیرہ عربی لغت کی یہ سب کتابیں میز پر رکھوا دیتے تھے، اور اصلاح کرتے وقت جس لفظ میں ذرا سا بھی شبہ ہوتا پاس بیٹھے ہوئے شاگرد سے کہتے کہ لغت میں دیکھو اور پڑھو، یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریر میں زبان و محاورہ کی غلطیاں بہت ہی کم ہوتی تھیں اور اسی کو دیکھ کر عرب کے فصحاء اور اہل زبان تعجب کرتے تھے، اور انہیں اس پر خراج تحسین ادا کرتے تھے، اگرچہ ہندوستان اور خود ندوہ میں ان کے علاوہ اور بھی پختہ کار صاحب قلم موجود تھے، اور ہیں، لیکن مولانا محمد ناظم ندوی کی روایت ہے کہ الجزائر کے محمد البشیر الابراهیمی سے جب اس بارے میں ذکر آیا، تو انہوں نے کہا کہ مسعود الندوی اصحهم لغةً (مسعود ندوی کی زبان ان سب سے صحیح ہوتی ہے) زبان و محاورہ کی صحت کے بارے میں ان کا یہ اہتمام صرف عربی ہی کی حد تک محدود نہ تھا، بلکہ ان کے جاننے والوں کو معلوم ہے کہ وہ اردو اور انگریزی تک میں اس غیر معمولی اہتمام کے پابند تھے، انگریزی اخبار اسٹیٹسمین وہ اس لیے پابندی کے ساتھ پڑھتے تھے کہ زبان کے اعتبار سے وہ اس کا معیار بہت اونچا سمجھتے تھے۔" (۱)

---

(۱) پرانے چراغ ص: ۳۱۸

الغرض آپ کا اسلوب نہایت ہی سادہ اور دل کو موہ لینے والا ہے۔ آپ کی عربی تحریروں کے مطالعے سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ زبان اور بلاغت کا کتنا اعلیٰ اور نازک ذوق رکھتے تھے، اس بارے میں ان کی نظیر ملنا مشکل ہے، چنانچہ نمونے کے طور پر ہم یہاں ان کی ایک خالص ادبی تحریر کا ایک اقتباس پیش کرتے ہیں، جو "الزھــرات" کے مقدمے میں ملتی ہے، اصحاب ذوق اور عربی زبان وادب سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لیے یہ سطریں اندازہ کے لیے کافی ہوں گی۔

> هذه حال اللغة العربية ، وهولاء شعراء ها فی مهد العروبة والارض التی بها نبتت فی الاقطار التی استعربت و تعربت فنطقت بلغة العرب و تديئت بدياناتهم ، حتی اصبحت بلدانا عربية كالجزيرة او اكثر منها، لكن لغة العرب ماكانت تنحصر فی منطقة جغرافية ضيقة فانها ماكادت تشرق شمس الاسلام حتی اخترقت دائرتها الاقلية وتبعت القرآن المجيد و وقفت اثره و ذهبت، حيثما ذهب به حملة دين النبیؐ و تسربت الی الفرس المومنين بالله فی كل صقع، فوجدت من قلبهم تربة صالحة وقع عليها غيثها فانبتت من كل زوج بهيج "(۱)

مذکورہ بالا سطریں آپ کے اسلوب خاص کا نمونہ ہیں، ان میں الفاظ کا حسن انتخاب، سلاست وروانی، ترکیبوں کی چستی صاف نمایاں ہے۔ اسی طرح جب ہم مولانا کی مشہور کتاب "نظرة اجمالية فی تاريخ الدعوة الاسلامة فی الهند و باكستان" کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان کی تاریخ نویسی اور عربی زبان وادب کی ادبیت کے جملہ محاسن ہی سامنے نہیں آتے۔ بلکہ عربی ادب میں ان کے یہاں جوش وجذبہ کے عناصر بھی نہایت نمایاں نظر آتے ہیں۔ ہر کسی کی تحریر کو وہ پہلے اسلامی نقطہ نظر سے دیکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ مصطفیٰ صادق الرافعی اور امیر

---

(۱) الزہرات

شکیب ارسلان کو صف اول کے ادیبوں میں شمار کرتے تھے، اور ان دونوں کے بہت زیادہ معتقد تھے، ظاہر ہے کہ دینی غیرت و حمیت اور اسلامی جوش و جذبہ ان حضرات کی تحریر کا نمایاں عنصر ہے، اس کے بر خلاف وہ طٰہٰ حسین کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے۔

اسی طرح جب جماعت اسلامی کا تعارف کراتے ہیں تو دینی جوش و جذبہ سے بھرپور ان کا قلم روانی کے ساتھ موتی بکھیرتے ہوئے چلتا ہے۔ عبارت نہایت سہل اور اسلوب نہایت ہی بلیغ ہوتا ہے اور اس عبارت کو بار بار پڑھنے کا جی چاہتا ہے۔

ان کے کلام کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ اس میں ایجاز و اختصار ہوتا تھا، لیکن ساتھ ہی ساتھ عبارت واضح بھی ہوتی تھی، ایسا نہ تھا کہ ایجاز و اختصار کی وجہ سے بات مبہم رہ جاتی ہو، بلکہ جو کچھ آپ نے لکھا ہے وہ ماقلّ و دلّ کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ اس سلسلے میں مولانا محمد کاظم سباق لکھتے ہیں:

> "اور اس فن کا (ایجاز نگاری) بہترین نمونہ انہوں نے اپنے کتابچہ "عربوں کی قومی تحریک" میں پیش کیا ہے، جس میں انہوں نے دریا کو کوزے میں بند کر کے رکھ دیا ہے اور ایک ایک پیرا اس شان کا لکھا ہے کہ تاریخ عرب کا پورا ایک باب اس میں سما گیا ہے، ایجاز و اختصار کے اسی اصول کی طرف رہبری کرتے ہوئے راقم الحروف کو اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:
>
> "مرادفات کا آپ نے کثرت سے استعمال کیا ہے، تین تین چار تک آپ مترادف جملے لیتے آئے ہیں، میں نے اس میں کمی کر دی ہے، بعض لوگ اسے پسند کرتے ہیں لیکن جو طریقہ ماثوراً مولانا شبلی سے ہم تک پہنچا ہے وہ اس کے بر خلاف ہے۔ مولانا شبلی اپنے شاگردوں سے فرمایا کرتے تھے کہ تحریر میں جتنے ایسے جملے نظر آئیں، جن کے نکالنے سے مطلب خبط نہ ہو، انہیں حذف کر دو، پختہ مشق لکھنے والوں کی یہی شان ہوتی ہے کہ وہ مختصر اور جامع لکھتے ہیں (۱)

---

(۱) چراغ راہ ص: ۱۷۹

الغرض مولانا کا ایک خاص اسلوب تھا جس میں فصیح و بلیغ استعاروں اور شستہ و شگفتہ لفظوں کا انتخاب ہوتا تھا، عربی ضرب المثل اور ترکیبوں کی بندش ہوتی تھی، الفاظ کا حسن انتخاب اور قرآن کریم کی آیات سے استفادہ ہوتا تھا، سلاست و روانی اور وضاحت و صفائی ہوتی تھی۔

ایک کامیاب مترجم

مولانا ایک کامیاب مترجم بھی تھے، مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ رحمۃ اللہ علیہ کی کتابوں کا ترجمہ اس انداز سے کیا ہے کہ ترجمہ کا گمان بھی نہیں ہوتا ہے، جماعت اسلامی کا بیشتر لٹریچر آپ ہی کی زیر نگرانی عربی میں ترجمہ ہوا، اور اسی کے ذریعہ عالم عرب جماعت کی دعوت سے متعارف ہوا، یہ ایسا کارنامہ ہے جسے کبھی بھلایا نہیں جاسکتا۔ چنانچہ علی میاں ندوی لکھتے ہیں:

> ”جماعت اسلامی کے پاس اردو کے بڑے اچھے نثار اور افسانہ نویس تھے، لیکن کوئی ایسا عربی کا ادیب اور صاحب قلم نہ تھا جو اس کی دعوت کو ممالک عربیہ میں پہنچانے کی صلاحیت رکھتا ہو، مسعود صاحب کی ذات میں اس کو عربی میں دعوت کا ایک کامیاب ترجمان اور ممالک عربیہ کے لیے ایک فاضل سفیر مل گیا۔“(۱)

اور یہ حقیقت ہے کہ مسعود صاحب کی شکل میں تحریک اسلامی کو ممالک عربیہ کے لیے ایک کامیاب ترجمان مل گیا تھا، اور جماعت اسلامی کی دعوت کو جس انداز میں مسعود صاحب نے ممالک عربیہ تک پہنچایا، وہ انہی کا حصہ ہے۔

مسعود عالم ندوی کی زبان دانی کا اعتراف ان کے استاد تقی الدین ہلالی ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

---

(۱) الفرقان، ذی الحجہ ۱۳۶۹ھ ص:۴۱

”۱۳۶۶ھ میں جب میں کوشش کر کے عراق واپس پہنچا تو مسعود صاحب نے مولانا مودودی کے جن رسالوں کا ترجمہ کیا تھا، ان کا ایک ایک نسخہ مجھے روانہ کیا۔ میں نے ان رسالوں کی زبان دیکھی تو نہایت شستہ اور ہر قسم کی کمزوریوں اور غلطیوں سے صاف تھی، مادی اور روحانی استعمار کے اس زمانے میں عرب مصنفین اور ادباء کے قلموں پر جو غلط ترکیبیں رائج ہو گئی ہیں ان رسالوں کی زبان ان سے پاک تھی۔“(۱)

اسی طرح عرب دنیا کے سب سے بڑے ادیب علامہ محمد البشیر الابراہیمی نے دارالعروبۃ کے عربی میں ترجمہ شدہ رسالوں کی بابت لکھا:

”میں نے ان رسالوں کے اندر الفاظ و معانی میں ایسی مناسبت اور ہم آہنگی پائی ہے کہ بالکل محسوس نہیں ہوتا کہ یہ ایک زبان سے دوسری زبان میں نقل کیے گئے ہیں اور اس کا راز یہ ہے کہ موضوع بھی اسلامی ہے اور دونوں زبانیں بھی اسلامی اور مولف اور مترجم دونوں ایک ہی فکر (فکر قرآن) کے پروردہ ہیں۔ اس لیے اس ترجمے میں روح نے اپنی کار فرمائی دکھائی ہے۔

ہمارے دوست مسعود صاحب اللہ کا لطف ان کے شامل حال ہو۔“(۲)

ان کے ایک اعلیٰ ترجمے کی مثال مولانا سیّد سلیمان ندویؒ کی مشہور مقبول کتاب جہاز رانی، عرب و ہند کے تعلقات ہے، جو صحت ترجمہ کے ساتھ بلاغت، روانی اور برجستگی کی عمدہ مثال اور نمونہ ہے۔

ندوۃ العلماء کا علمی و ادبی ترجمان ”الضیاء“

الضیاء دارالعلوم ندوۃ العلماء کا علمی و دینی ترجمان تھا، مولانا مسعود عالم ندوی

---

(۱) چراغ راہ، مسعود عالم ندوی نمبر ص : ۱۶

(۲) ایضاً مسعود عالم ندوی نمبر ص : ۱۷۳

اس کے ایڈیٹر، ڈاکٹر تقی الدین ہلالی اور علامہ سیّد سلیمان ندوی اس رسالے کے سرپرست تھے۔

محرم ۱۳۵۱ھ (مئی ۱۹۳۲ء) سے اس عربی ماہنامے کا آغاز ہوا، رسالہ اگرچہ پتھر پر چھپتا تھا، لیکن زبان کی صحت، حسن انشاء اور مضامین کی بلندی کی وجہ سے عربی ممالک کے علمی وادبی حلقوں میں بے حد مقبول ہوا، لیکن چار سال کے بعد عرب ممالک تک ہندوستان کے حالات اور دینی و علمی مضامین کا پہنچانے والا یہ واحد عربی رسالہ خود ارباب ندوہ کی نگاہ عتاب کا شکار ہو کر ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔ اگرچہ مسعود صاحب نے بذات خود اس رسالے کو جاری رکھنے کی مسلسل کوشش کی، لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔ ۱۱ مارچ ۱۹۳۶ء کو علامہ سیّد سلیمان ندوی مسعود صاحب کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"الضیاء کی تعویق سے تکلیف ہے، اب نئے سال سے ہمت کرو، اللہ مددگار ہے، ان تنصر الله ينصركم۔"

اس خط پر مسعود صاحب کا نوٹ یوں ہے:

"الضیاء بھی استاد ممدوح کی علالت کے زمانے میں ارباب ندوہ کی نگاہ عتاب کا شکار ہو گیا، سیّد صاحب قبلہ علیل تھے، مالی امداد مل نہ سکی، اہل ندوہ نے رائے قائم کی کہ ان کی یعنی مدیر الضیاء کی شوخیاں اسی رسالے کے بل پر ہیں، کیوں نہ اسے مرنے دیا جائے؟ ان دانش مندوں کو یہ خیال نہ آیا کہ ذاتی پرخاش میں وہ اپنا آرگن خود ہی ختم کر رہے ہیں۔ وہ چاہتے تو مجھے الگ کر کے کسی دوسرے کو ایڈیٹر بنا سکتے تھے۔"

یہ رسالہ میانہ تقطیع کے چالیس صفحات پر مشتمل ہوتا تھا، اس میں ایڈیٹر کے علاوہ نمایاں اور مستقل لکھنے والوں میں سے چند کے نام یہ ہیں: شیخ تقی الدین ہلالی، علامہ سیّد سلیمان ندوی، مولانا سیّد ابوالحسن علی میاں ندوی، مولانا محمد ناظم ندوی وغیرہ۔

اس رسالے میں علمی، دینی، تعلیمی، تاریخی اور دیگر مسائل پر تحقیقی مقالات ہوا کرتے تھے۔ خالص ادبی مضامین کا بھی ایک سلسلہ ہوتا تھا اور "سیر الحوادث" اخبار و آثار اور "نظرات" کے عنوان سے عالم اسلام کے واقعات پر تبصرہ خود ایڈیٹر کے قلم سے ہوتا تھا۔ مولانا مسعود صاحب رسالے کو خود ترتیب دیتے، مضامین کی نوک پلک درست کرتے، لوگوں سے مضامین طلب کرتے، باہر سے آنے والے تمام خطوط کا جواب دیتے، خود ہی حساب کتاب رکھتے، خود ہی تمام پرچوں پر پتے لکھ کر روانہ کرتے، باہر سے جو عربی پرچے آتے ان سب کو پورے اہتمام سے پڑھتے اور جہاں کسی مضمون کی تردید کرنا ضروری سمجھتے، اس رسالے میں اس کی تردید بھی خود ہی کرتے، گویا کہ "الضیاء" کا پورا بار آپ ہی کے کندھوں پر تھا، لیکن اس کے باوجود یہ رسالہ چار سال تک پورے آب و تاب کے ساتھ نکلتا رہا، اور عرب ادباء اس کو پڑھ کر جھومتے تھے، انہوں نے دل کھول کر اس رسالے کی اور اس کے جواں سال مدیر کی حوصلہ افزائی کی۔ حیرت و مسرت کے ساتھ اس رسالے کا زبردست استقبال کیا، تمام ادبی رسالوں نے اس پر تبصرے شائع کیے۔ اور ان کو حیرت اس بات پر تھی کہ ہندوستان سے نکلنے والے اس عربی رسالے کی زبان عرب ممالک سے نکلنے والے رسالوں سے کہیں زیادہ معیاری تھی، چنانچہ "المجمع العربی دمشق" جو عربی ممالک میں ایک اہم علمی و ادبی اکادمی ہے،، نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا۔

ليس العجب ان تنهض العربية فى تونس و الجزائر و مراكش و انما العجب ان يطع خياؤها و يخفق لواؤها فى بلاد العجم ...... كنهوضها اليوم فى بلاد الهند بواسطة الغيور من اساتذتها، فقد انشاء هؤلاء الاساتذة مجلة علمية ادبية تعليمية اجتماعية ولغة الانشاء فيها هى لغة مصر بما عهدنا من فصاحتها و ناصح عروبتها، وان القائم بانشاء تلك المجلة الاستاذ مسعود عالم الندوى " (۱)

(۱) الضیاء، شوال ۱۳۵۱ھ

ترجمہ: تونس، الجزائر اور مراکش میں عربی زبان کا نشوونما کوئی تعجب کی بات نہیں، تعجب کا مقام تو یہ ہے کہ غیر عرب ممالک میں اس زبان کی روشنی پھیل رہی ہے اور وہاں اس کا جھنڈا لہرا رہا ہے جیسا کہ آج ہندوستان میں صاحب فن اساتذہ کے توسط سے اس زبان کی ترقی ہو رہی ہے۔ انہوں نے ایک علمی، ادبی، تعلیمی اور اجتماعی رسالے کی داغ بیل ڈالی ہے اور اس رسالے کی زبان اپنی فصاحت اور واضح عربیت میں مصر کے موجودہ عہد کی زبان ہے، اس رسالے کے جاری کرنے والے استاذ مسعود عالم ندوی ہیں۔

اسی طرح سے عالم عرب کے متعدد ادباء نے اپنی اپنی رائے کا اظہار کیا ہے، اس زمانے میں بغداد (عراق) سے ایک عیسائی ادیب "الاب انستاس الکرملی" کی زیر ادارت ایک رسالہ "لغة العرب" کے نام سے نکلتا تھا۔ موصوف نے اپنے ایک خط میں مسعود صاحب کو علامہ کے لفظ سے خطاب کیا ہے لکھتے ہیں:

بغداد فی ۲۰ / ۱۱ / ۱۹۳۲ء سیدی الجلیل

القبکم بالعلامة و ان کنتم فی حداثه السن ولیست العبرة بالعمر انما العبرة بالعلم رای فی مجلتکم انها تردم تغرة واسعة فی الآداب العربیة، و عسی ان تنجحوا فی مساعیکم (۱)

ترجمہ: اگرچہ آپ نوعمر ہیں لیکن آپ کے علمی تبحّر کی وجہ سے میں آپ کو علامہ کے لقب سے نواز رہا ہوں۔ اور میری رائے کے مطابق آپ کا رسالہ عربی ادب میں ایک بہت بڑے خلاء کو پر کر رہا ہے اور جلد ہی آپ اپنی کوششوں میں کامیابی سے ہمکنار ہوں گے۔"

اس رسالے نے بہت جلد عرب ادباء کی نظروں میں ایک اہم مقام حاصل کر لیا۔ مسعود صاحب کا نام بھی پورے عالم عرب میں گونجنے لگا، ہر طرف سے مبارکباد اور تحسین

---

(۱) الضیاء، شوال ۱۳۵۱ھ

کے خطوط آتے رہے، مصر، الجزائر، تونس اور مراکش کے ادیبوں نے دل کھول کر داد دی، یہاں تک کہ عربی کے پایے کے اہل قلم امین ناصر الدین نے جو محقق اور لغوی تھے اس رسالے کے بارے میں یوں لکھا:

"عربوں کے لیے مقام غیرت ہے کہ ان کے اکثر و بیشتر رسالوں سے اس عجمی ملک کے رسالے کی زبان بہتر و برتر ہوتی ہے۔ رب کعبہ کی قسم، یہ کیا تعجب کا مقام ہے کہ کتاب الٰہی کی زبان اپنے وطن سے زیادہ ایک عجمی ملک میں پر شوکت اور باوقار ہو۔"(۱)

عالم اسلام کے مشہور علماء اور ادباء سے الضیاء اور مسعود عالم صاحب کے گہرے روابط تھے اور مراسم و روابط کی کڑی یہی الضیاء تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر رسالوں میں امیر شکیب ارسلان، سیّد رشید رضا، اور دوسرے ادباء و اہل قلم کے مراسلات ملتے ہیں، جن میں عرب ممالک کے ادیبوں کی زبان اور انداز بیان اور ان کے فکر کے فساد پر انہیں آڑے ہاتھوں لیا گیا ہے اور انہیں "الضیاء" کی مثال دے کر شرم دلائی گئی ہے۔ ڈاکٹر تقی الدین ہلالی لکھتے ہیں:

"یہ رسالہ عربی کے تمام رسائل و اخبارات کے نزدیک حد درجہ مقبول ہوا۔ اکثر پرچے اس کے مضامین اپنے صفحات میں نقل کرنے لگے، جس سے تمام عربی ممالک میں مسعود عالم صاحب کی شہرت کو چار چاند لگ گئے، اور عالم اسلامی کے تمام ادباء اور علماء ان کے علم و ادب کا اعتراف کرنے لگے۔ یہ وہ چیز ہے جو ہندوستان بھر کے کسی دوسرے ادیب اور عالم کو اس عمر میں نصیب نہیں ہوئی"(۲)

مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی جو اس رسالے کے مستقل لکھنے والوں میں سے تھے، اس رسالے کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

"رسالہ (الضیاء) کے مضمون نگار اگرچہ بہت محدود تھے اور پرچہ پتھر پر

---

(۱) چراغ راہ، ۱۷۳

(۲) چراغ راہ، مسعود عالم ندوی نمبر ص:۱۶

چھپتا تھا جو عرب قارئین کے مذاق طبیعت کے بہت خلاف اور ان کی نگاہوں پر بار ہوتا ہے، لیکن زبان کی صحت، حسن انشاء اور مضامین کی بلندی کی وجہ سے وہ ممالک عربیہ کے سنجیدہ علمی و ادبی حلقوں میں بہت مقبول ہوا۔ اور اس کا بڑی گرم جوشی کے ساتھ استقبال کیا گیا، اور موقرو وقیع رسائل و مجلّات نے دل کھول کر داد دی۔ لبنان کے امیر ناصرالدین نے جو اپنی ادبی تنقید اور ادبی ذکاوتِ حس میں بدنامی کی حد تک نامور تھے، اپنے اخبار "الصفا" میں بڑے بلند کلمات کے ساتھ تبصرہ کیا، غالباً اسی میں تھا کہ یہ ہندی رسالہ اپنی صحت زبان اور عربیت میں خود ممالک عربیہ کے بہت سے رسالوں پر فوقیت رکھتا ہے، اسی طرح "صیدا" شام کے مشہور ادبی رسالہ "العرفان" نے بڑا زوردار تبصرہ کیا.......... اس رسالے میں علاوہ ادبی مضامین کے عالم اسلام کی اہم خبریں اور ہندوستان کے سیاسی حالات پر تبصرہ اور تلخیص بھی ہوتی تھی، مسعود صاحب یہ حصہ بھی پوری روانی اور بے تکلفی سے لکھتے تھے، وہ عموماً مضامین قلم برداشتہ لکھتے تھے، اور اپنے مسودہ میں بے تکلف اصلاح کرتے۔ میں بھی ایک طرح سے رسالے کا ایک مستقل مضمون نگار ہونے کی وجہ سے شریک ادارت تھا، اور بہت غور و فکر کے ساتھ بنا سنوار کر لکھنے کا عادی تھا، جو مضامین جلد دینے کے ہوتے تھے یا ادارتی اور صحافتی قسم کے ہوتے وہ مسعود صاحب خود ہی لکھتے۔ جس مضمون کو بہت اہتمام سے لکھنا ہوتا وہ اکثر میرے سپرد کرتے اور کہتے تھے کہ میں تو پیشہ ور لکھنے والا (Professional) ہوں، اس سرعت کے باوجود ان کے ہر مقالے میں ادبی چاشنی اور زبان کا لطف ہوتا تھا۔"(۱)

●●

---

(۱) پرانے چراغ ص:۳۲۱

باب سوم

مولانا مسعود عالم ندوی

اہل علم کی نظر میں

مسعود عالم ندوی

اہل علم کی نظر میں

مولانا مسعود عالم ندوی صرف ہندوپاک کی ہی ایک بڑی شخصیّت اور عربی زبان و ادب کے ماہر انشاء پردازنہ تھے، بلکہ تمام عالم اسلامی میں ایک اہم مقام رکھتے تھے، اور ان کے چاہنے والوں کا حلقہ بہت وسیع تھا، عربی زبان وادب سے محبت اور اسلامی غیرت و حمیت کی وجہ سے ایک وسیع حلقہ آپ کے جاننے والوں کا بھی تھا، جس کا اندازہ ان کے سفرنامے ”دیار عرب میں چند ماہ“ کے مطالعے سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

چنانچہ آپ کی وفات کے بعد عالم اسلام کی ممتاز اور اہم شخصیتوں نے اپنے قلبی تاثرات کا اظہار کیا، آپ کی شخصیت کے مختلف گوشوں کو اجاگر کیا ہے، اور جو لوگ پاکستان میں موجود تھے، انہوں نے آپ کی نماز جنازہ میں شرکت کی اور اس کو اپنے لیے باعث افتخار سمجھا، عرب ممالک کے سفیروں نے نماز جنازہ میں شرکت کی اور ایسے جذبات واحساسات کا اظہار کیا، جو عجم اور عرب کے مابین محبت و یگانگت کا مظہر ہیں۔

ہم اس باب میں بعض اہم شخصیتوں کے تاثرات نقل کرتے ہیں، جو عالم اسلامی کی معروف اور جانی پہچانی ہیں۔ ایک عالم، ایک مصنف، ایک مورخ اور عربی ادب وانشاء کے مایہ ناز سپوت کے اٹھ جانے سے عالم اسلام کا دل جس طرح سے تڑپا ہے یہ تاثرات اور جذبات اس کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ ان کے مطالعے سے جہاں ایک طرف مسعود صاحب کی شخصیت کی اہمیت کا اندازہ ہوگا، دوسری طرف ان کی علمی خدمات کی مزید تفصیل سامنے آئے گی۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ مرحوم

برادر عزیز (۱) ......السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

....

....

....

مولانا مسعود عالم صاحب کی وفات پر اس کے سوا کیا لکھوں کہ اس کے بعد سے اپنا ایک بازو ٹوٹا ہوا محسوس کرتا ہوں۔ بلکہ شاید جسم کا بازو ٹوٹنے کی بھی اتنی تکلیف نہ ہوتی، جتنی روح کے اس بازو کے ٹوٹ جانے سے محسوس ہو رہی ہے۔

اللہ تعالیٰ ان کو اجر جزیل عطا فرمائے، اور اپنے دین کے لیے ویسا ہی کوئی دوسرا خادم پیدا کر دے۔ بظاہر تو یہ جگہ پر ہونی مشکل ہے، مگر اللہ کی قدرت ہر چیز پر حاوی ہے۔(۲)

....

.... والسلام

ابوالاعلیٰ

---

(۱) مسعود عالم ندوی کے خاص رفیق اور شاگرد محمد عاصم صاحب کے نام ایک خط میں ان تاثرات کا اظہار مودودی صاحب نے کیا ہے۔

(۲) چراغ راہ، مسعود عالم ندوی نمبر ص: ۱۲ ـ ـ ـ

مولانا مودودیؒ کا ایک دوسرا جامع تاثر

مولانا مسعود عالم ندویؒ کی وفات ایک ایسا حادثہ ہے جس نے مجھے سخت متاثر کیا ہے، اس نقصان کو کچھ وہی لوگ محسوس کر سکتے ہیں جو ان کے اوصاف اور کاموں سے واقف ہیں، وہ اس ملک کے ان چند گنے چنے لوگوں میں سے تھے جن کو عربی ادب وانشاء میں ایک بلند مقام حاصل ہوا ہے۔ اپنی اس قابلیت سے کام لے کر انہوں نے بر عظیم ہندوپاکستان کے مسلمانوں اور عربی زبان بولنے والے مسلمانوں کے درمیان سفارت کے فرائض انجام دیے۔ عرب ممالک کو یہاں کے حالات اور مسائل اور تحریکوں سے روشناس کرانے میں ان کا بہت بڑا حصہ ہے اور اس خدمت کی قدر و قیمت کا اندازہ صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہیں معلوم ہے کہ مختلف مسلمان ملکوں کے درمیان براہ راست ذرائع معلومات نہ ہونا اور ان کا ایک دوسرے کو جاننے کے لیے محض فرنگی وسائل اطلاعات پر انحصار کرنا کتنا نقصان دہ ہے اس لحاظ سے ان کی وفات در حقیقت ایک قومی نقصان ہے جس کی تلافی کرنے والے کم ہی نظر آتے ہیں۔

جماعت اسلامی ہند سے تعلق رکھنے والوں نے ان کے فقدان کو خاص طور پر شدت کے ساتھ محسوس کیا ہے، کیوں کہ انہیں مرحوم کی خوبیوں اور خدمات سے براہ راست سابقہ پیش آیا ہے، وہ ایسے حلقے سے تعلق رکھتے تھے جس کے اکابر جماعت اسلامی کو پسند نہ کرتے تھے، دوسری طرف، جماعت اسلامی کی بنا جن لوگوں نے ڈالی تھی ان میں سے کسی کے ساتھ بھی مرحوم کے شخصی مراسم نہ تھے بلکہ مجھ سمیت اکثر سے ان کی کبھی ملاقات تک نہ ہوئی تھی۔ اس کے باوجود مرحوم نے محض "ترجمان القرآن" میں جماعت اسلامی کی دعوت اور نصب العین پڑھ کر بلا تکلف اس کو قبول کیا اور خود اس کی طرف بڑھنے میں پیش قدمی کی، بغیر اس کے کہ ادھر سے کوئی تحریک کی گئی ہو، یہ اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ ان کا دل تعصب سے پاک تھا، وہ اپنی رائے میں آزاد تھے ان کا ضمیر انصاف پسند تھا، اور وہ جس چیز کو حق پاتے تھے، اسے پورے خلوص کے ساتھ قبول کر لیتے تھے، بعد میں تیرہ

چودہ سال کے قریبی تعاون کے دوران دن میں ہر موقع پر ان کے یہ اوصاف عملاً مشاہدے میں آتے رہے، اس کے ساتھ ذہنی توازن کا یہ حال تھا کہ جماعت سے گہرا تعلق ہو جانے کے بعد بھی اپنے ان اکابر سے ان کے ذاتی تعلق میں کوئی فرق نہ آیا۔ نہ ان کی محبت و عقیدت جماعت اسلامی کے ساتھ ان کی وابستگی میں کبھی خلل انداز ہوئی اور نہ جماعت سے وابستگی نے ان کے ساتھ شخصی روابط کو کبھی غبار آلود کیا۔

جماعت میں شامل ہوتے ہی انہوں نے محسوس کر لیا کہ جس نصب العین کو اب وہ اختیار کر چکے ہیں وہ ہمہ تن پوری زندگی کا وقف نامہ طلب کرتا ہے، چنانچہ کچھ دیر نہ گزرنے پائی تھی کہ وہ اپنی ساری کشتیاں جلا کر آگئے اور جماعتی نظام کے تحت انہوں نے "دارالعروبۃ" قائم کیا۔ جس کا مقصد تحریک اسلامی کے لٹریچر کو عربی میں منتقل کر کے انڈونیشیا سے مراکو تک پھیلی ہوئی اسلامی دنیا تک پہنچانا تھا۔ اس کے ساتھ انہوں نے ایسے نوجوان تیار کرنے کی کوشش بھی شروع کر دی جو صحیح عربی لکھنے پر قادر ہوں تاکہ ان کے کام کو آئندہ جاری رکھ سکیں۔ اور یہ سب کچھ انہوں نے ایک ایسی جاں گسل بیماری کی حالت میں کیا جس نے ان کو گھلا کر صرف ہڈی اور چمڑے کا ڈھانچہ بنا ڈالا تھا۔ یہ ان کے عزم اور اخلاص نیت اور جذبۂ ایثار و قربانی کا حال تھا۔ وہ ایک چیز کو حق جاننے کے بعد اسے صرف قبول ہی کر کے نہ رہ گئے، بلکہ اس کو فروغ دینے کے لیے انہوں نے اپنی جان لڑا دی، اس کی خاطر اپنی دنیوی ترقی کے سارے مواقع کو جو ان جیسی قابلیت کے آدمی کے لیے کچھ کم درخشاں نہ تھے، قربان کر دیا۔ اپنا سارا وقت اور سارا سرمایۂ قوت و صلاحیت اسی ایک راہ میں کھپا دیا۔ یہ خوبی جہاں جس انسان میں بھی پائی جاتی ہو، بجائے خود قابل قدر ہے، خصوصاً ہماری قوم میں تو اس وقت اس صفت کے حامل لوگوں کا قحط ہے، اس لیے ان کی قدر و قیمت اس سے بدرجہا زیادہ ہے جو کسی مالدار قوم میں ہو سکتی ہے۔

۱۹۵۳ء میں جماعت اسلامی پر جو دور ابتلاء آیا، (بلکہ سچ یہ ہے کہ زبردستی لایا گیا) اس میں مرحوم کا صبر و ثبات ہم سب کے لیے قابل رشک ہے، وہ سالہا سال سے دمے کے مریض تھے، ایسے سخت مریض کہ دمے کے دورے کی وہ حالت کبھی ہمارے مشاہدے میں نہیں آئی۔ ان کی صحت تمام تر دوا اور غذا کے خاص اہتمام اور اوقات کی باقاعدگی پر منحصر

تھی، اور ان چیزوں میں سے کسی میں فرق آجانا ان کے لیے پیام موت تھا۔ اس حالت میں حکومت نے یکایک ان کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیا، اور ان کے مرض کا لحاظ کر کے علاج و غذا کا کوئی انتظام نہ کیا۔ حتیٰ کہ اس مریض ناتواں کو جیل میں چارپائی تک نہ دی گئی، جو لوگ اس ظلم کے ذمہ دار تھے ان کو قطعاً کوئی احساس نہ تھا کہ وہ اپنی قوم کے کیسے قیمتی جوہر کو ضائع کر رہے ہیں اور مرحوم کی غیرت یہ گوارا کرنے کے لیے تیار نہ تھی کہ اپنے مرض کا حوالہ دے کر کسی ظالم سے رحم کی بھیک مانگیں، جو تکلیفیں بھی پیش آئیں کمال درجہ صبر اور تسلیم و رضا کے ساتھ جھیلتے چلے گئے اور اف تک نہ کی، بعید نہیں کہ یہی چیز آخر کار ان کی اچانک وفات کی موجب ہوئی ہو، بہر حال چلتے چلتے اس مرد مومن نے استقامت کا ایک ایسا نمونہ پیش کیا جو بہت سے اہل ایمان کے لیے تقویت قلب کا سبب بنا اور ان شاء اللہ آئندہ بھی بنے گا!

تیرہ چودہ سال کی رفاقت میں ہم لوگوں نے ان کو ہمیشہ ایک مخلص دوست، ایک بے لاگ مشیر اور ایک وسیع القلب و وسیع النظر انسان پایا۔ بہت سی باتوں میں دوسروں سے اختلاف رکھنے اور حسب ضرورت اظہار اختلاف کرنے کے باوجود وہ اپنی رائے میں کبھی شدت اختیار نہ کرتے تھے کہ ان کے ساتھ موافقت مشکل ہو جائے۔ رائے میں نہایت آزاد اور اظہار رائے میں نہایت بے باک تھے، مگر بحث و تمحیص کے بعد جب کامیاب کرنے میں اپنی حد تک کوئی کسر نہ اٹھا رکھتے تھے، کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اپنی رائے کے خلاف کسی جماعتی فیصلے پر وہ کبیدہ خاطر ہوئے ہوں یا ان کے گوشۂ قلب میں بھی یہ خواہش چھپی ہوئی پائی گئی ہو کہ وہ فیصلہ ناکام ہو اور ان کی رائے کی صحت ثابت ہو جائے۔ اجتماعی زندگی کے لیے یہ صفت اکسیر کا حکم رکھتی ہے۔

ذاتی حیثیت سے ان کی وفات میرے لیے ایک صدمۂ عظیم ہے، تعریف اور مذمت کرنے والوں کی کمی نہیں ہے، مگر خیر خواہ ناصح دنیا میں کم ہی میسر آتے ہیں۔ رحمۃ اللہ و طاب ثراہ۔(۱)

---

(۱) شخصیات، ماہنامہ ذکریٰ کا خاص نمبر رام پور، یوپی، صفحہ ۲۵۷ تا ۲۶۰ بحوالہ ماہنامہ ترجمان القرآن، شوال ۱۳۷۴ھ جون ۱۹۵۵ء

ایک لفظی تصویر

نعیم صدیقی

حلیہ، لباس، اطوار بالکل سادہ، لیکن سراپا سے ایک صاحب عظمت شخصیت کا اظہار!

قامت اوسط سے کچھ کم۔ قیمت اوسط سے بہت زیادہ!
جسم کم جگہ گھیرنے والا! روح آفاق گیر!
مختصر سالمبوترا چہرہ، لیکن وجاہت غیر معمولی!
آنکھیں چھوٹی!...... نگاہ دل کی گہرائیوں میں اتر جانے والی! ناک پتلی مگر اونچی رہنے والی!
ہونٹ باریک، غنچوں کی سی سمٹی ہوئی مسکراہٹ سے اکثر مزین! داڑھی گھنی اور لمبی، لیکن چہرے کے متناسب!
بال بالکل سیاہ، چہرے کی رنگت کو نمایاں کرنے والے!
ظاہری رنگ گندمی! باطنی رنگ "صبغۃ اللہ"!
ابروؤں کی خمدار محرابیں خوب ابھری ہوئی! ان محرابوں کے نیچے پلکوں کی صفیں کبھی قیام میں کبھی سجود میں!
زبان میں لکنت پھر بھی حق گوئی میں رواں!
پاؤں میں کبھی چپل، کبھی دیسی جوتی، کبھی بوٹ!
سر پر گاہے، ٹوپی، گاہے حاجیوں کا سارومال!

بالعموم ہلکے تنگ پاجامے کا استعمال۔۔ کبھی کبھی مکان پر تہمت باندھنا! سردیوں میں کبھی روئی دار بنڈی اور کبھی نہرو کٹ واسکٹ زیب تن، گھر سے نکلنے اور مجلس میں بیٹھنے کی صورت میں پابندی سے شیروانی کا استعمال۔۔ کبھی کھدر کی، کبھی مشینی کپڑے کی!

کپڑوں کا رنگ ہمیشہ سفید یا صوفیانہ۔۔ مثلاً خاکی، چاکلیٹی، بادامی وغیرہ!

کبھی کبھی اونچی آواز میں قہقہہ آ...... آ...... آ...... کے صوتی تسلسل سے!

سہو، ندامت، بیزاری، ذہنی کوفت، قلبی کرب کا اظہار تیزی سے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر!

قطع کلام کی اجازت لینے یا کسی کو مداخلت بے جا سے روکنے کے لیے بغیر منہ سے کچھ کہے، انگلیاں جوڑ کر ہاتھ آگے بڑھانا اور چہرے سے لجاجت کا اظہار!

قبول واعتراف کے لیے کبھی کبھی ہلکی آواز میں بس: ہہ......بس...... ہہ...... بس تسلسل سے کہنا!

تردید کے لیے خاص خاص جذباتی موقعوں پر مسکرا کر آں...... آں...... کیا اور ساتھ ہی ہاتھ کے اشارے سے روکنا!

کسی ملاقاتی کے آجانے پر شدت احترام سے اضطراری طور پر جسم کا متحرک ہونا......اپنے قریب کی جگہ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنے کا اشارہ!

شوریٰ کے اجلاس میں متعدد آدمیوں کے بولنے پر پوائنٹ آف آڈر کے لیے مسکرا کر میز کو ایک یا دو انگلیوں سے آہستہ آہستہ تھپتھپانا!(۱)

---

(۱) چراغ راہ، مسعود عالم ندوی نمبر ص: ۴

ماہر القادری

مولانا مسعود عالم ندوی کو علمی دنیا نے سب سے پہلے مجلّہ "الضیاء" کے عربی مضامین کے ذریعہ پہنچانا، وہ "خدا بخش لائبریری" کے ذریعہ جانے گئے اور یہ وہ دوراہہ تھا، جہاں سے دو راستے پھوٹتے تھے۔

ایک اقامت دین کا راستہ، دوسرا دنیوی شہرت و ترقی اور حصول جاہ و زر کا راستہ!

ان دونوں راستوں میں سے کسی ایک راستے کے انتخاب میں وہ مختار تھے، یہ بڑا نازک مسئلہ تھا، ایسے موقع پر نفس و ضمیر کی کش مکش بڑی شدید اور ہنگامہ خیز ہوتی ہے!

دوراہہ، دو موڑ، دو راستے، ایک میں شہرت کے پرچم لہراتے ہوئے، عیش و راحت کی بزم جمی ہوئی، زر و مال کے ڈھیر جہاں تہاں بکھرے ہوئے، نفس کی لذتوں کے قدم قدم پر مواقع اور زریں مواقع!

بے فکری کی زندگی ـــ اور دوسرے راستے میں حد نظر تک کانٹے بچھے ہوئے، خشک اور غیر دلچسپ سفر، ہر قدم پر طرح طرح کے خطرے، کہ نہ جانے کب کیا ہو جائے! جاہ و دولت کا دور دور پتہ نہیں، اور بھی نفس کی لذتوں کی قربانی اس راہ کی پہلی شرط تھی مگر..................

مسعود عالم کی حق شناس فطرت نے اسی دوسرے راستے کا انتخاب کیا، اور وہ دوٹوک فیصلہ کر کے اس منزل پر چل پڑے...... ان کی پچھلی زندگی کے بعض ساتھیوں نے ان کو ٹوکا بھی بلکہ مذاق بھی اڑایا، کہ تم کو کیا چاہیے تھا اور کیا بنے جا رہے ہو، مگر مرحوم نے ساتھیوں کے طنز و طعن کو گوارا کر لیا، انہوں نے دوراہے پر کھڑے ہوئے ساتھیوں کو پھر مڑ کر بھی نہ دیکھا، منزلِ سفر کے اس انتخاب پر انہیں بعض بزرگوں کی تھوڑی بہت کبیدہ خاطری بھی برداشت کرنا پڑی، مگر اب انہوں نے اپنے فکر و عمل کی زمام اللہ کی رضا اور خوشنودی کی

گرفت میں دے دی تھی! تیر کمان سے چھٹ چکا تھا، لوٹ کر کیسے آتا۔ وہ اس راہ میں اپنے خدا سے پیمانِ وفا باندھ کر چلے تھے اور آخر دم تک چلتے ہی رہے!

مسافر اور ضیق النفس کا بیمار مسافر کہ بعض وقت سانس کا دورہ پڑتا تو:۔

جو اکھڑی سانس تو بیمارِ غم سنبھل نہ سکا
ہوا تھی تیز چراغ حیات جل نہ سکا

کا سماں پیدا ہو جاتا ہے، مگر ذرا افاقہ ہوتے ہی راہِ حق کا یہ مسافر پھر چل پڑتا ہے!۔

آرام سے فارغ صفت ِ جوہر سیماب!

ہندوستان اور پاکستان میں جہاں تک عربی انشاء پردازی کا تعلق ہے دو تین آدمی مشکل ہی سے ان کے ٹکر کے نکلیں گے۔

وہ عربی ادب کے بلا شبہ "شکیب ارسلان" تھے، اگر مرحوم مصر اور شام چلے جاتے تو ان کی بڑی قدردانی ہوتی، اور اپنے قلم کے زور سے بڑی دولت اور نام پیدا کرتے مگر وہ اپنے قلم کو خدمت دین کے لئے وقف کر چکے تھے، پھر ان چٹخاروں میں کیسے الجھتے۔

مسعود عالم ایک فرد نہیں اپنی ذات سے ایک اکیڈیمی تھے، مگر اس اکیڈیمی میں اہرام مصر کی تاریخ، فراعنہ کی ممیوں کے افسانوں، ام کلثوم اور عبد الوہاب کی موسیقی کی ریسرچ، طرفہ او رابو نو اس کی شاعری پر بحثیں نہیں ہوتی تھیں، یہاں کی فضا میں "قال اللہ "اور "قال الرسولؐ" کے نغمے گونجتے تھے، حق و صداقت کے ترجمانی ہوتی تھی، اور وہ مرقع ترتیب دیے جاتے تھے، جن کی پہلی لکیر اور آخری خط میں "اقامت دین" کی بھر پور جھلک پائی جاتی تھی" (۱)

---

(۱) چراغ راہ مسعود عالم ندوی نمبر ص : ۳۰

مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی

(مولانا مسعود عالم ندوی) کی وفات علمی، ادبی اور دینی حیثیت سے ایک بڑا خسارہ ہے، بلاشبہ ایک بڑا صاحب قلم اور اس بر صغیر ہندوپاکستان کا سب سے بڑا عربی کا انشاء پرداز اٹھ گیا، اس پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے، لیکن میرے لیے یہ حادثہ ذاتی نوعیت کا ہے، میرا تیس برس کا مخلص رفیق، چاہنے والا دوست، شفقت کرنے والا بھائی، میری کامیابی سے خوش ہونے والا لغزش پر متنبہ کرنے والا ساتھی، دنیا سے اٹھ گیا۔

زمانہ جس رخ پر جا رہا ہے اور جس خود غرضی اور مادیت کا دور دورہ ہے، اس کے پیش نظر اس کی بہت کم امید ہے، کہ ایسے سچے دوست، باوقار رفیق اور مخلص ساتھی پیدا ہوں گے۔ اگر ہماری قوم بیدار ہوتی، اور اس میں جوہر شناسی اور فراخ حوصلگی کا مادہ ہوتا تو ان کی ذات سے بڑا نفع اٹھایا جا سکتا تھا، ان سے نصاب کی ترتیب میں مدد لی جا سکتی تھی، ان سے عربی مدارس عربیت اور انشاء کے بارے میں استفادہ کر سکتے تھے، طلبہ اور علوم عربیہ کے شائقین اطراف واکناف سے ان سے فائدہ اٹھانے کے لیے آتے۔

لیکن افسوس ہے کہ ان سے ان کے شایان شان فائدہ نہ اٹھایا گیا، اور ایک محدود حلقے کے سوا بہت کم لوگوں نے ان کو پہچانا، اور ان سے فائدہ اٹھایا، ان کی عمر ۴۴ سال سے زیادہ نہیں ہوئی، اس عمر میں انہوں نے بڑے بڑے کام کیے اور ایسی تصانیف یادگار چھوڑیں، جو ایک شخص کو کامیاب مصنف اور نامور صاحب علم و صاحب قلم بنانے کے لیے کافی ہیں۔

کسی شخص کے افتخار کے لیے وہ سرمایہ ناکافی نہیں، جو انہوں نے چھوڑا، مگر جو لوگ ان کی ذہنی اور علمی صلاحیتوں سے واقف تھے، اور جو ان کے علم و فکر کا ارتقاء دیکھ رہے تھے، اور جن کو اس کی آرزو تھی کہ بہت دن زندہ رہیں اور کام کریں، ان کی زبان پر بصد حسرت ویاس یہ مصرعہ ہے ؎

خوش درخشید ولے دولت مستعجل بود(۱)

---

(۱) پرانے چراغ ص:۳۵۶۔۳۵۷

محمد امین الحسینی (مفتی فلسطین)

الاستاذ مسعود الندوی

الحمد لله رب العلمین والصلاۃ والسلام علی سید المرسلین وآلہ وصحبہ اجمعین، تبارك الذی بیدہ الملك وھو علی کل شی قدیر الذی خلق الموت والحیاۃ لیبلوکم ایکم احسن عملاً، وھو العزیز الغفور،

استاد مسعود عالم ندوی مرحوم سے میری پہلی ملاقات ۱۹۳۳ء میں ندوۃ العلماء، لکھنو میں ہوئی تھی، اس وقت میں ہندوستان آیا ہوا تھا۔

ندوۃ العلماء وہ بابرکت ادارہ ہے جس نے عربی زبان کے ماہرین اور اسلام کے سچے خادموں کی ایک کثیر تعداد دنیا میں پیش کی۔ یہی وہ برگزیدہ علماء تھے جنہوں نے ہر قیمت پر علم کے علم کو ہمیشہ بلند رکھا اور ہندوستان و دیگر ممالک بالخصوص ممالک اسلامیہ میں عربی زبان کی نشر و اشاعت کا کام اپنے سر لیا۔ میں نے مرحوم کو جواں عمری ہی میں اسلام کی خدمت اور اعلائے کلمۃ الحق کے جذبے سے بھرپور پایا، کچھ عرصہ بعد موصوف میدان عمل میں کود پڑے اور اس کے بعد اپنے قلم، زبان اور تحریر سے دعوتِ اسلامی کی نشر و اشاعت میں مصروف ہو گئے۔

راولپنڈی وغیرہ میں دار العروبۃ للدعوۃ الاسلامیۃ قائم کر کے ٹھوس کام شروع کیا، اور وہاں سے عربی کے رسالے اور کتابیں چھپوا کر پاکستان، بلاد عرب اور ممالک اسلامیہ میں پھیلاتے رہے۔

مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم اکثر مجھے خط لکھا کرتے تھے، کبھی مسلمانوں کے اہم

مسائل پر اپنا ہمدردانہ نقطۂ نگاہ واضح کرتے اور کبھی کسی اور موضوع پر، یوں کہنا چاہیے کہ ان کا دم غنیمت تھا، کیوں کہ اسلامی غیرت و حمیت اور عربی زبان کے عشق کے ساتھ ساتھ موصوف بہترین مضمون نگار تھے، اور عربی تحریر میں ایک خاص ملکہ رکھتے تھے، اللہ کی راہ میں کماحقہ جہاد کرتے کرتے جان جاں آفریں کے سپرد کی۔

ابھی چوالیس پینتالیس سال کی عمر تھی، اور وہ اپنی علمی پختگی کو پہنچ چکے تھے کہ اللہ کی رحمت نے اپنے دامن میں چھپالیا، ہمیں ان سے ابھی بہت کچھ توقعات تھیں، اس کی حکمت اس کی مشیت کون جانے؟ انسانی عقل وادراک سے بالا ہے اور ہر ایک جاندار کا وقت معین ہے، جسے کون ٹال سکتا ہے۔

ہم لوگ دست بدعاء ہیں کہ اللہ رب العزت مرحوم کو غریق رحمت فرمائے، عالم باعمل کا پورا پورا اجر عطا کرے، اور صالحین کی جماعت میں شامل کرے۔(۱)

---

(۱) چراغ راہ، مسعود عالم ندوی نمبر ص: ۱۳-۱۴

داعی حق

جو ہم سے جدا ہو گیا!

محمد محمود الصواف

ایڈیٹر: الاخوۃ الاسلامیۃ

(بغداد)

مولانا مسعود عالم ندوی عالم باعمل اور داعی مخلص تھے، سچے دل سے میدان عمل میں کود جانے والے سپاہی، محبت و شفقت سے بھرپور دل رکھنے والے دوست اور اہم پیچیدہ مسائل میں بہترین مشیر تھے، معمولی احسان کا بدلہ بھی احسان سے چکاتے تھے۔ میرا ان سے تعارف اس وقت ہوا، جب وہ ممالک عرب کے دورے پر بغداد تشریف لائے۔ مجھے بے حد خوشی ہوئی، کیوں کہ ان سے مل کر میں ایسا محسوس کرتا تھا کہ میں ایک مجسم فضل و تقویٰ علم و عمل اور صاحب فکر و نظر سے شرف ملاقات حاصل کر رہا ہوں، اور ان کے ادب و تدوین، فراست ایمانی اور دقت نظر کا سکہ میرے دل میں بیٹھتا جا رہا ہے اللہ نے قرآن عربی میں نازل فرمایا، اس زبان سے انہیں خاص شغف تھا، اس سے انہیں اس حد تک انسیت تھی کہ اللہ نے انہیں عربی کے مضمون نگاروں کی صف اول میں شامل کیا۔ یہی نہیں بلکہ آپ اس زبان کی خدمت میں ہمیشہ اپنے ہم عصروں میں سب سے پیش پیش رہے۔ بیس سال پیشتر عربی کا ایک رسالہ ''الضیاء'' ہندوستان سے نکالا، جو چار سال تک جاری رہا، اسی رسالے کی بدولت عرب ممالک کے باشندوں کو معلوم ہوا کہ اسلام کی خدمت کے لیے بالخصوص اور مسلمانان عالم کی خدمت کے لیے بالعموم یہ شخص کیا کچھ کرنا چاہتا ہے۔ جیسا کہ ان کی طرح ان کے ساتھی سیّد ابوالحسن علی ندوی کی کوششوں سے بھی لوگ مستفید ہوتے رہے۔

وہ مملکت پاکستان اور وہاں کے باشندوں کے بالعموم اور وہاں کی تحریک اسلامی کے بالخصوص صحیح نمائندہ اور ترجمان تھے، اس لیے کہ ہمیں ان سے پاکستان کے اور وہاں کی جماعتوں کے وہ حالات معلوم ہوئے، جن سے بلاد عرب بالکل ناواقف تھے، گویا انہوں نے ہمیں وہاں کے باشندوں سے قریب تر کر دیا، اور پھر انہوں نے پاکستان اور ہندوستان میں تحریک اسلامی کی مکمل روداد لکھی، جس سے وہاں کے مجاہدین کے مصائب و مشکلات کا صحیح اندازہ ہوا، یہاں سے واپسی پر مولانا نے "بلاد عرب میں چند ماہ" کتاب لکھ کر یہاں کے مسلمانوں کے حالات اور کوائف سے یہاں کی تحریکوں سے اپنے ملک کے مسلمانوں کو باخبر کیا، اس طرح یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ انہوں نے تنہا وہ کام کیا، جو دونوں ممالک خود نہ کر سکے۔

ان کا سب سے بڑا احسان، جسے عرصہ تک اخوان المسلمون کے نوجوان بالخصوص اور ملت اسلامیہ کے بالعموم نہیں بھلا سکتے، یہ ہے کہ انہوں نے جماعت اسلامی پاکستان کے امیر مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی تصنیفات کے عربی تراجم کا سلسلہ شروع کر کے ہمیں ان کے علم سے مستفید ہونے کا موقع دیا۔

ہمارے لیے مولانا کی یہ کتابیں ایک نادر عطیہ ہیں، جنہیں اخوان نے اپنی اہم کتابوں میں شمار کیا ہے۔ اور ہمارے نوجوان انہیں سبقاً سبقاً پڑھتے، یاد کرتے، اور اس طرح قدر و منزلت کی میزان میں گرانقدر بنائے رکھتے ہیں، گویا یہ قیمتی موتی ہیں، جن کو مولانا مودودیؒ نے مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کی وساطت سے عرب دنیا کو ہدیہ کیا ہے"(۱)

(۱) چراغ راہ، مسعود عالم ندوی نمبر ص: ۱۷۔۱۸ - - -

طٰہٰ فیاض

ایڈیٹر روزنامہ السجل

(بغداد)

کراچی سے آنے والے ایک تار سے اطلاع ملی ہے کہ ۱۶/مارچ ۵۴ء کی شام علامہ سیّد مسعود الندوی اس دنیا سے رخصت ہو گئے، مرحوم کی عمر ابھی زیادہ نہ تھی، لیکن یہ عمر بھی تصنیف و تالیف اور قلمی جہاد میں بسر ہوئی۔

مرحوم ایک جرأت مند اور باحوصلہ شخصیت کے مالک تھے، عربی اور اردو دونوں زبانوں کے ذریعہ ایک ساتھ اسلام کی دعوت کو پھیلاتے رہے، آپ کا تعلق پاکستان کی جماعت اسلامی سے تھا، حال ہی میں مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی کے ساتھ قید و بند کے مرحلے سے بھی گزرے، مرحوم اپنا تمام وقت علامہ مودودی کی تصنیفات کا عربی میں ترجمہ کرنے کے لیے صرف کرتے تھے، عربی زبان میں آپ کو بڑا ملکہ حاصل تھا، ان کی عربی تحریر سے ہرگز یہ معلوم نہ ہوتا تھا کہ ان کی مادری زبان عربی کے علاوہ کوئی دوسری ہے۔"(۱)

(۱) چراغ راہ، مسعود عالم ندویؒ ص: ۲۰

استاذ احمد مظہر العظمۃ

ایڈیٹر "التمدن الاسلامی"
(دمشق)

اسلام ایک انسان میں کس قدر عظیم الشان انقلاب برپا کرتا اور اللہ کے لیے کام کرنے کی راہ میں ہر قسم کی رکاوٹیں دور کر دیتا ہے۔ اس کی مثال اس زمانے میں ہمارے سامنے مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم تھے، جنہیں اسلام اور عربیت سے اس قدر محبت تھی کہ عجمی ہونے کے باوجود عربی کے چند نمایاں علمبرداروں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔

۱۳۵۱ھ میں انہوں نے لکھنو سے ایک عربی ماہنامہ "الضیاء" جاری فرمایا، چار سال تک یہ رسالہ عربی زبان کی خدمت کرتا رہا، دوسری جنگ عظیم ختم ہونے کے بعد مسعود صاحب نے دار العروبۃ کی بنیاد رکھی، کہاں؟ مکہ معظمہ میں نہیں، دمشق میں نہیں، بغداد میں نہیں، قاہرہ میں نہیں...... بلکہ راولپنڈی میں، پھر اس ادارے نے حق کی آواز کو دنیا میں پھیلانا شروع کیا، یہ اس جماعت اسلامی کا عربی شعبہ ہے جس کے موسس مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی ہیں۔

مرحوم کی مثال قرآن کی ایک آیت میں یوں بیان کی گئی ہے:

اے نبی ﷺ! اگر آپ دنیا بھر کا مال و متاع بھی صرف کر دیتے تو ان لوگوں کے دلوں میں محبت و الفت نہ ڈال سکتے تھے لیکن اللہ نے ان کے دلوں میں محبت و الفت پیدا کر دی۔" آپ کو عربی زبان سے محبت بلکہ عشق تھا، اس وجہ سے نہیں تھا کہ یہ عربوں کی

زبان ہے جو جزیرہ عرب سے اٹھی ہے، بلکہ یہ محبت و عشق اس لیے تھا کہ یہ وحی الٰہی اور دین خداوندی کی زبان ہے۔ اس لیے کہ یہ قرآن اور نبی ﷺ کی زبان ہے، اس کے بغیر دنیا بھر کے مسلمان مل کر بھائیوں کی طرح کبھی زندگی بسر نہیں کر سکتے۔ لہٰذا مسلم عربیت سے ان کا تعلق کوئی قومی یا لسانی تعلق نہ تھا بلکہ وہ مادہ کا جوہر سے، جسم کا روح سے اور زندگی کا اپنی صحیح اور بلند قدروں سے تھا۔

جو شخص مرحوم کی تحریروں کو پڑھے گا، اسے معلوم ہو گا کہ ان کے ایمان میں کس قدر قوت تھی، اور ان کا ادب کس قدر بلند اور شستہ تھا، ان کی تحریر ایک فنی انداز میں تہذیب و ادب کی تحریر تھی، جس سے ان کے گہرے مطالعہ باریک بینی، دینی تڑپ، رقت قلب اور زندگی و وجدان کا اندازہ ہوتا ہے۔

میری خواہش تھی کہ میں مرحوم کے متعلق پوری تفصیل سے لکھتا، اور ان کی تمام خوبیوں اور کمالات کو ظاہر کرتا مگر وقت کی تنگی نے اجازت نہیں دی مجبوراً ان چند سطروں پر اکتفاء کرتا ہوں، ہمارے ہاں ایسے صاحب علم اور جذبہ رکھنے والے علماء پائے گئے اس پر ہمیں فخر ہے کیوں کہ اسلام اور عربیت کو ہمیشہ اس قسم کے بہترین داعی حق لوگوں پر فخر رہا ہے

يفخر الدهر بالقليل من النا — س كما تفخر البحور بدر

ومن الدر عالم شبهه الشمـ — س وما النور فى الظلام بسر

ذاك (مسعودنا) الفقيد فحيا — ه اله يجزى الجميل باجر

ترجمہ: کم ہی لوگ ایسے ہوتے ہیں جن پر زمانہ کو فخر ہوتا ہے، جیسا کہ سمندر اپنے موتیوں پر فخر کرتے ہیں موتی میں سے وہ عالم ہوتا ہے جو سورج کے مشابہ ہوتا ہے اور اندھیرے میں روشنی کوئی بھید نہیں، یہ ہمارے مسعود ہیں، اللہ جو ہر احسان کا بدلہ دیتا ہے آپ کو زندگی عطا فرمائے"(۱)

---

(۱) چراغ راہ، [illegible] ندوی نمبر ص ۱۸[illegible]

ڈاکٹر محمد تقی الدین الہلالی

(بغداد)

۱۳۴۹ھ ۱۹۳۸ء کا واقعہ ہے کہ مجھے لکھنؤ کے دار العلوم ندوۃ العلماء میں عربی ادب کی تعلیم دینے کے لیے دعوت دی گئی، مجھے یہ دعوت علامہ سیّد سلیمان ندوی نے دی تھی، جب میں ندوہ پہنچا تو میں نے دیکھا کہ وہاں کے طلبہ اگرچہ عربی ادب کے از حد شوقین اور اسے سیکھنے کے لیے انتہائی محبت کرنے والے تھے، لیکن ہندوستان میں قرآن کی زبان پڑھانے کا جو طریقہ اس وقت رائج تھا، وہ بالکل بے کار اور طلبہ کو عربی ادب کے ذوق سے دور ہی رکھنے والا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سورج کو اس قدر بادلوں نے ڈھانپ لیا ہے کہ اس کا چہرہ اہل زمین کے لیے نظر آنا ناممکن ہو گیا ہے مجھے عربی زبان کی یہ مظلومیت دیکھ کر بڑا دکھ ہوا۔ میں نے پہلے ہی دن سے اپنے طریقے کے مطابق عربی پڑھانا شروع کی، میں پڑھاتے وقت کسی کتاب کا اردو میں ترجمہ نہ کراتا تھا بلکہ پڑھاتے وقت شروع سے آخر تک عربی کے علاوہ دوسری کوئی زبان استعمال نہ کرتا تھا، ان طلبہ میں ایک طالب علم مسعود عالم کو میرا یہ طریقۂ تعلیم بے حد پسند آیا، طلبہ کی عادت عموماً یہ ہوتی ہے کہ وہ جماعت میں اپنا سبق پڑھنے کے بعد نہ صرف محنت نہیں کرتے بلکہ اس کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتے، لیکن مسعود عالم اکثر اوقات میرے ساتھ ہی رہتے، جب موقع ملتا، میرے ہاں آموجود ہوتے، کبھی کسی موضوع کے متعلق سوال کر رہے ہیں اور کبھی کسی موضوع کے متعلق، عربی میں بولنے کی مشق کے خیال سے مختلف مسائل پر مجھ سے بحث بھی کرتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑی ہی مدت گزرنے کے بعد وہ اپنے مقصد میں بڑی حد تک کامیاب نظر آنے

لگے اور ان میں عربی ادب کا نہایت اعلیٰ ذوق پیدا ہو گیا۔ اس کے بعد علامہ سیّد سلیمان ندویؒ کی رائے ہوئی کہ دارالعلوم ندوہ سے ایک عربی ماہنامہ جاری کیا جائے جس کے ذریعہ خود دارالعلوم کے طلبہ بھی عربی انشاء کی مشق کر سکیں اور اس ملک کے دوسرے مدارس کے طلبہ میں بھی عربی ادب کا ذوق پیدا کیا جا سکے۔ چنانچہ انہوں نے یہ ذمہ داری میرے سپرد کی، کسی عربی رسالے کا جاری کرنا اور اس میں طلبہ کا لکھنا، ہندوستان کے عربی مدارس کے نزدیک ایک "بدعت" سے کم نہ تھا، اور یہ اندازہ کرنا بڑا مشکل تھا کہ ہم اپنی اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہو سکیں گے۔ لیکن میں نے سیّد صاحبؒ کی اس تجویز کا پر جوش خیر مقدم کیا اور تمام رکاوٹوں اور مشکلات کو سامنے رکھتے ہوئے اس کام کا بیڑا اٹھایا، ندوہ کے طلبہ میں نظر دوڑائی کہ ان میں سب سے زیادہ میرے کام کا کون ہے اور مجھے سب سے زیادہ امداد کس سے مل سکتی ہے؟ لیکن مجھے مسعود عالم سے بڑھ کر اس کام کے لیے موزوں کوئی طالب علم نظر نہ آیا۔

رسالے کی ادارت ان ہی کے سپرد کی گئی اور میں اس کا نگراں مقرر ہوا۔ اس زمانے میں مسعود عالم صاحب کی ذہانت کے جوہر کھلے، دو سال تک رسالہ میری نگرانی میں چلتا رہا لیکن اس کے بعد کچھ میری صحت کی خرابی اور کچھ دوسرے حالات نے مجھے ہندوستان چھوڑ کر عراق واپس آجانے پر مجبور کر دیا۔ میں رسالہ پوری طرح مسعود عالم ہی کے حوالے کر کے عراق چلا آیا، اس کے بعد رسالہ دو سال تک پوری شان سے جاری رہا اور اس کے فصاحت وبلاغت، حسن ترتیب اور دوسری خوبیوں میں ذرا کمی نہ آئی۔

یہ رسالہ عربی کے تمام رسائل واخبارات کے نزدیک حد درجہ مقبول ہوا۔ اکثر پرچے اس کے مضامین اپنے صفحات میں نقل کرنے لگے، جس سے تمام عربی ممالک میں مسعود عالم صاحب کی شہرت کو چار چاند لگ گئے، اور عالم اسلام کے تمام ادباء اور علماء ان کے علم وادب کا اعتراف کرنے لگے، یہ وہ چیز ہے جو ہندوستان بھر کے کسی دوسرے ادیب اور عالم کو اس عمر میں نصیب نہیں ہوئی ....

.... اللہ تعالیٰ انہیں اپنی رحمت سے ڈھانکے، اور اپنے نیک بندوں کے ساتھ جنت میں داخل کرے، جوانمردی، ہمت اور صبر واستقلال میں مسعود عالم صاحب ایک بے نظیر شخصیت کے مالک تھے۔"(۱)

●●

(۱) چراغ راہ، مسعود عالم ندوی نمبر ص:۱٦

رئیس احمد جعفری ندوی

آہ، کس طرح اسے مرحوم لکھوں، جو زندگی سے بھرپور تھا، جس نے اسلام اور ملت اسلامیہ کی صلاح و فلاح کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی تھی، جس نے زندگی کی ساری امنگوں اور حوصلوں کو، ترقی کے سارے امکانات کو، عروج دنیاوی کے تمام توقعات کو ٹھکرا دیا، وہ عربی زبان پر وہی دسترس رکھتا تھا، جو ایک اہل زبان رکھتا ہے، جس کا دل بھی مسلمان تھا، دماغ بھی، روح بھی، اور فکر و تخیل بھی، وہ دشمنوں کو دوست بنا لیتا تھا، دوستوں سے مخالفت مول لیتا تھا، اپنوں سے روٹھ جاتا تھا اگر مقصد اور منزل کا سوال در پیش ہو............

.... جماعت اسلامی کے ذہنی اور علمی افکار کو جس خوبی سے مسعود عالم نے عربی میں منتقل کیا ہے وہ انہی کا حصہ ہے، لاکھوں روپیہ صرف کرنے کے بعد بھی اس خوبی اور سلیقہ سے یہ کام انجام نہیں پا سکتا تھا، جو اس فقیر بوریہ نشین نے کر دکھایا"(۱)

---

(۱) چراغ راہ، مسعود عالم ندوی نمبر ص:۳۸

مولانا عبدالماجد ندوی (۱)

(ندوۃ العلماء لکھنؤ)

داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

آہ! کہ ایک حادثہ (۲) جانکاہ کو ابھی پورے چار ماہ بھی نہ گزرے تھے کہ ایک دوسرا حادثہ پیش آگیا۔ آہ! کہ ندوہ کا ایک لائق ترین فرزند، دعوت اسلامی کا مرد مجاہد، ملک وملت کا درد مند، دین کا داعی، اسلام کا سپاہی، دینی غیرت واسلامی حمیت کا پیکر، اردو اور عربی کا ایک بلند پایہ انشاء پرداز وباکمال صحافی، اخلاص وعمل کا نمونہ، سنت رسول کا شیدائی مسعود عالم ندوی ۱۶/ مارچ کی شب کو یکایک ہم سے جدا ہو گیا...

مولانا مسعود عالم ندوی کو ندوۃ العلماء کے مثالی تخیل کا نمونہ کہا جا سکتا ہے، اور فی الواقع وہ تھے بھی، مولانا مسعود عالم جدید وقدیم کی جامعیت کی نمائندگی کرتے تھے اور ندوہ کے فقہی مسلک اعتدال کی بھی! وہ مسلکاً سلفی العقیدہ تھے، مگر گروہی اہل حدیث نہ تھے، وہ ہر قسم کی گروہی عصبیتوں سے پاک تھے، ان کا فقہی مذہب حضرت شاہ ولی اللہؒ کا "مسلک اعتدال" تھا۔ قدرت کی طرف سے بڑے اچھے دل ودماغ لے کر پیدا ہوئے تھے، روشن فکر درد مند دل اور سلجھا ہوا دماغ پایا تھا، ذہن وذکاوت کے ساتھ قوت حافظہ بھی بہت قوی تھی۔ ۷/ سال سے وہ ضیق النفس کے مریض تھے، اس لیے قدرتی طور پر بہت زیادہ کمزور اور نحیف تھے، مگر اس

---

(۱) مصنف معلم الانشاء

(۲) علامہ سید سلیمان ندویؒ کی جانب اشارہ ہے۔

نحیف وناتواں جسم میں وہ ایک چیتے کا جگر اور شیر کی طرح مضبوط دل رکھتے تھے۔

ترى الرجل النحيف و تزدريه
وفي اثوابه اسد مزيد

ٹھوس اور تحقیقی مطالعہ ان کا سرمایہ علم تھا، تاریخ پر گہری اور تنقیدی نظر رکھتے تھے، اور ملکی سیاسیات سے نہ صرف یہ کہ باخبر تھے، بلکہ اس پر اپنی ناقدانہ رائے بھی رکھتے تھے، سیاسی اور غیر سیاسی تحریکات کے پس منظر سے واقف تھے، ادب عربی کا بہت اعلیٰ اور ستھرا انداق رکھتے تھے۔ لغت و قواعد پر ان کی گہری نظر تھی، اس کی باریکیوں کے مبصر تھے۔ الفاظ کی تحقیق میں ید طولیٰ رکھتے تھے، عربی کے وہ بلند پایہ اور فطری انشاء پرداز تھے، قلم برداشتہ تحریر کا ان کو عجیب ملکہ تھا۔ تحریر میں برجستگی، سلاست اور روانی ہوتی، بچے تلے الفاظ، چست ترکیبیں، اچھوتے استعارات، نادر تشبیہیں مولانا کی تحریر کی خاص خصوصیت تھی، تحریر حشو و زوائد سے پاک ہوتی۔ موقع موقع سے محاورات و امثال بھی استعمال کرتے، مگر اس میں کوئی تکلف نہ ہوتا، پڑھنے والا محسوس کرتا کہ جیسے جگہ جگہ موتی جڑ دیے گئے ہیں۔

دینی غیرت وحمیت کی مولانا ایک زندہ مثال تھے، حق کے معاملے میں کسی قسم کی معمولی مداہنت کو بھی وہ جائز نہیں سمجھتے تھے، حق گوئی و بے باکی ان کی امتیازی صفت تھی۔ لگی لپٹی بات کرنے کے عادی نہ تھے، ہمیشہ کھری اور دوٹوک بات کہتے۔ جس بات کو حق سمجھتے اس کو پوری قوت اور زور کے ساتھ پیش کرتے، اور اسی شدت کے ساتھ اس پر قائم بھی رہتے، اور جس بات کو وہ غلط سمجھتے برملا اس کو غلط کہتے، اس معاملے میں کسی عزیز اور دوست کی بھی رعایت نہ کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے قلب کو مداہنت فی الدین سے پاک بنایا تھا۔ یہ ان کی سیرت و کردار کی سب سے بڑی خصوصیت تھی۔ تملق کی باتوں سے انہیں سخت نفرت تھی۔ وہ اپنی مدح و ستائش سننا پسند نہیں فرماتے تھے۔ اس لیے ان کے یہاں

خوشامدیوں اور قصیدہ خوانوں کا ذکر کم تھا۔

اللہ تعالیٰ نے ان کو ایمان کی فراست بخشی تھی۔ وہ بڑے مردم شناس بھی تھے۔ پہلی ہی نظر میں افراد کو بھانپ لیتے، اس لیے غلط قسم کے لوگ ان کے اردگرد جمع نہ ہو سکتے تھے۔

استاد مرحوم کی وفات جماعت اسلامی کے لیے ایک ناقابل تلافی نقصان اور سانحۂ عظیم ہے۔ استاد مرحوم جماعت اسلامی کے نہ صرف اہم رکن تھے بلکہ اس کے تین بڑے اساطین میں سے ایک تھے۔ مولانا مودودیؒ کے دست و بازو تھے............... بلاد عربیہ سے جماعت اسلامی کا ربط تنہا ان کی ذات سے قائم تھا اور ان سے بڑھ کر زیادہ موزوں اس کام کے لیے دوسرا ہو بھی کون سکتا تھا۔(۱)

---

(۱) چراغ راہ، مسعود عالم ندوی نمبر ص: ۱۱۳

امین احسن اصلاحیؒ

مولانا مسعود عالم ندوی علیہ الرحمۃ کی جن خوبیوں نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا، ان میں سے ایک چیز ان کے دل کی صفائی تھی، میں نے ان کی اس خوبی کا بار بار تجربہ کیا ہے .... ان کی دوسری خوبی جس سے میں بہت زیادہ متاثر ہوا۔ وہ یہ تھی کہ وہ دلیل کی قوت کو جوں ہی محسوس کر لیتے، فوراً اس کے آگے سر جھکا دیتے۔ وہ جماعت کے اندر ایک صاحب الرائے آدمی تھے اور ہمیشہ اپنی رائے پورے زور و قوت کے ساتھ پیش کرتے تھے۔ لیکن اگر دلیل سے ان پر واضح ہو جائے کہ ان کی بات کمزور ہے، تو خواہ اس بات کو انہوں نے کتنے ہی زور کے ساتھ پیش کیا ہو، لیکن اس پر اصرار نہیں کرتے تھے، بلکہ فوراً اپنی غلطی اور مخالف کی بات کی صحت و صداقت کا اعتراف کر لیتے تھے اور انداز اعتراف ایسا ہوتا تھا جس سے مخاطب کو یہ احساس ہوتا کہ وہ اس اعتراف میں ایک قسم کی لذت اور خوشی محسوس کر رہے ہیں۔

معاملہ کے بڑے صاف تھے، پائی پائی کا حساب رکھتے تھے، ممکن نہیں تھا کہ کسی ایک کا دھیلا بھی ان کے ذمہ باقی رہ جائے۔ اسی طرح وہ دوسروں سے اپنے مطالبات وصول کرنے میں بھی سخت اور کھرے تھے۔"(۱)

---

(۱) چراغ راہ، مسعود عالم ؒ وی نمبر ص:۱۲۶

عبدالحمید صدیقی (ایم۔اے)

کائنات نے اپنی بقا کے لیے کبھی اشخاص کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلائے، مگر یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ اس عالم رنگ و بو میں جو زندگی بھی نظر آتی ہے وہ چند باہمت اشخاص ہی کی جدوجہد کا نتیجہ ہے۔ یہ شخصیتیں اگرچہ دنیا سے اٹھ جاتی ہیں مگر ان کی یاد ہمیشہ تازہ رہتی ہے، موت ان کے جسموں کو فنا کردینے پر قدرت رکھتی ہے مگر ان کی عظمت اس کی دسترس سے ہمیشہ محفوظ رہتی ہے۔ یہ لوگ اپنے پیراہن خاکی میں زندہ نہ سہی مگر اپنے اعمال و افعال، خیالات و تصورات میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جیتے ہیں۔ اپنے رفیق اعلیٰ کی قربت انہیں اس دنیا سے دور نہیں کرتی، انسانیت کے قافلے ان کے نقش پا کو دیکھ کر فوراً پکار اٹھتے ہیں۔ ع

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے

مرحوم مولانا مسعود عالم ندوی کا بھی انہی چند خوش نصیب لوگوں میں شمار ہوتا ہے وہ ایک فرد نہیں تھے، بلکہ اپنی ذات میں ایک تحریک، ایک انجمن تھے۔ اس لیے ان کی موت ایک فرد کی موت نہیں بلکہ ایک ادارے کی موت ہے۔(۱)

---

(۱) چراغ راہ، مسعود عالم ندوی نمبر ص:۱۱۷

عبداللہ عباس ندوی

استاد ندوۃ العلماء لکھنؤ

مولانا مسعود عالم ندوی کی دینی غیرت اور ان کا اسلامی جوش ان کی تحریر کا خاص اور نمایاں عنصر ہے۔ وہ پہلے مسلمان تھے اور بعد میں ادیب، ادب ان کا ہزار محبوب مضمون سہی، لیکن الحاد اور بے دینی کی راہ سے اس کو قبول کرنا نہیں چاہتے تھے اور کسی ایسے شخص کو وقعت دینے کے لیے تیار نہ تھے، جو صرف ادب برائے ادب کا قائل ہو، یہی وجہ ہے کہ مصطفیٰ صادق الرافعی اور امیر شکیب ارسلان کے حد درجہ معتقد تھے اور آخر الذکر سے انہیں قلبی تعلق تھا، اور ان کی تحریر بھی ان کے اسلوب سے متاثر تھی، اور ظاہر ہے کہ یہ دونوں دینی غیرت اور اسلامی جوش میں بلاشبہ عالم اسلامی کے گل سر سبد تھے، اس کے بر خلاف مولانا مسعود عالم ندوی نے کبھی طٰہٰ حسین یا عباس محمود العقاد کو اپنی نگاہ میں وقعت نہیں دی۔ حالانکہ ان لوگوں کا صاحب طرز انشاء پردازوں کی صف اول میں شمار ہے۔

ڈاکٹر طٰہٰ حسین کے متعلق ان کی کتاب "الشعر الجاھلی" پر مولانا نے سخت تبصرہ کیا تھا، نیز سیّد صاحبؒ کی کتاب لغات جدیدہ کے مقدمے میں طٰہٰ حسین کا نام تیسرے طبقہ میں لیا ہے۔ غالبًا طٰہٰ حسین کو اول طبقے سے اتار کر تیسرے طبقے میں گرانے والی چیز وہی دینی اور اسلامی حس تھی۔ (۱)

مولانا مسعود عالم ندویؒ کی زندگی اور ان کی علمی حیثیت اور خدمات کے بارے میں مشہور اہل علم حضرات نے جو کچھ روشنی مذکورہ تحریروں میں ڈالی ہے، انہیں پڑھ کر ان کی شخصیت کا پورا اندازہ ہو جاتا ہے، اور احساس ہوتا ہے کہ آپ کی شخصیت بلاشبہ ناقابل فراموش ہے۔

---

(۱) چراغ راہ، مسعود عالم ندوی نمبر ص: ۱۷۱

باب چہارم

مولانا مسعود عالم ندوی

اپنی تحریروں کے آئینے میں

مسعود عالم ندوی

اپنی تحریروں کے آئینے میں

مولانا مسعود عالم ندوی نے اپنی مختصر سی زندگی میں تصنیفات کا ایک اہم ذخیرہ چھوڑا ہے، یہ تصنیفات علمی بھی ہیں، دینی بھی، ادبی بھی ہیں اور تاریخی بھی۔

ان کی افادیت اور اہمیت اس وجہ سے بھی زیادہ ہے کہ ہر کتاب اپنے ساتھ ٹھوس علمی مواد اور دلائل رکھتی ہے۔ ہزاروں صفحات کے مطالعے کا نچوڑ ایک صفحہ پر آگیا ہے۔ اور یہی تحقیق کا اعلیٰ معیار ہے۔ ان تصنیفات میں مسعود صاحب کی شخصیت کے بارے میں خود ان ہی کے رواں قلم سے کچھ اہم اشارے بھی ملتے ہیں، عادات و خصائل کا پتہ چلتا ہے، عقائد و نظریات واضح ہوتے ہیں اور اخلاق و سیرت کی عکاسی ہوتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اپنی بے حد و حساب تواضع و انکساری کی وجہ سے بہت ہی کم اشارے مولانا نے اپنی ذات کے متعلق کیے ہیں۔ یہ ان کی بے نفسی، عالی ظرفی اور خلوص و محبت کی ایک بین دلیل ہے۔ یہاں تک کہ اپنے مشہور سفر نامے "دیار عرب میں چند ماہ" میں بھی اپنی ذات کی طرف بہت کم اشارے کیے ہیں۔ جبکہ اکثر اہل قلم سفر ناموں میں اپنی ذات کو ہی گفتگو کا مرجع بناتے ہیں۔

لیکن مسعود صاحب نے اس سفر نامے میں بھی دعوت و اخلاص اور دین اسلام کے موضوع ہی کو اپنا محور بنایا ہے۔

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لیے (۱)

---

(۱) مسعود عالم ندوی کی ذاتی ڈائری کے سرورق سے ماخوذ، جو زمانہ اسیری (۱۹۵۳ء) میں ان کے زیر استعمال رہی۔ بحوالہ: چراغ راہ، مسعود عالم ندوی نمبر ص: ۲۰

وان كنت ذا راى فكن ذا عزيمة   فان فسادالراى ان تتر دوا
واجرا من رايت بظهر غيب   على عيب الرجال ذو العيوب (۱)

(۱) ترجمہ: اگر تو کوئی رائے رکھتا ہے تو صاحب عزیمت بھی بن، اس لیے کہ ہر کام میں متردد رہنا رائے کے غلط اور خراب ہونے کی نشانی ہے

(۲) لوگوں کے پیٹھ پیچھے انہیں کوسنے اور برا بھلا کہنے میں وہ لوگ سب سے زیادہ جری ہوتے ہیں۔ جن کا دامن خود عیوب سے آلودہ ہوتا ہے۔

بدت لك فرصة للتعيش حرا   فحاذر ان تكون لها مضيعا
ومالك بعد هـٰذا اليوم يوم   فان لم تستطع لن تستطيعا (۲)

ترجمہ: تمہیں آزادانہ زندگی بسر کرنے کا ایک موقع ملا ہے۔ خبردار! اسے ہرگز ضائع نہ کرنا۔ یوں سمجھو کہ تمہارا یہ دن کام کرنے کے لیے آخری دن ہے۔ اگر تم نے یہ کام آج نہ کیا تو پھر کبھی نہ کر سکو گے۔

سوانحی اشارے

خلیج جھیل کی طرح ساکن ہے، گھنٹوں سوچتا رہتا ہوں...... عمر چالیس کے قریب ہونے کو آئی، بارہا سوال پیدا ہوتا ہے، کیا کیا؟ ندوہ کی زندگی علم وادب کی زندگی تھی، مگر نام نمود، جتھہ بندی، اور جوڑ توڑ کی برائیوں سے خالی نہ تھی، پٹنہ میں سات سال گزارے، سکون اور علمی سکون کی زندگی تھی، کتابوں اور ان کے عالی مرتبت مصنفین کی صحبت تھی، طالب علموں کے نقطۂ نگاہ سے قابل رشک زندگی تھی، مگر اس سکون کی قیمت بہت گراں، دل اندر سے بھینچتا تھا، سرکاری ملازمت اور آگے پیچھے نااہلوں سے واسطہ ہر آن مجاملت، ہر لحظہ مدارات، اپنی دنیا آپ بسانے کی کوشش کی، تو پٹنہ میں بھی ندوہ کے نام پر جتھہ بندی

---

(۱) ذاتی ڈائری سے ماخوذ، بحوالہ چراغ راہ، مسعود عالم ندوی نمبر ص: ۱۰۴

(۲) ذاتی ڈائری سے ماخوذ، بحوالہ چراغ راہ، مسعود عالم ندوی نمبر ص: ۲۰۰

شروع ہو گئی۔ بڑے بڑے معرکے ہوئے اور اللہ معاف کرے، جاہلیت کا آخری معرکہ اس وقت گرم ہوا، جب جماعت اسلامی قائم ہو چکی تھی اور خاکسار اس کا رکن تھا، جولائی ۱۹۴۲ء میں انجمن ترقی اردو کی صوبائی کانفرنس تھی، صوبائی انجمن ذاتی اغراض کی بنا پر مرکز سے باغی ہو رہی تھی، ہم لوگوں نے مرکز کی حمایت کا بیڑا اٹھایا، ہماری فوج میں اکثر و بیشتر سوشلسٹ اور کانگریسی نوجوان تھے، اس لیے غیر شعوری طور پر پارٹی لیڈر کی حیثیت سے عاجز کو آگے کر دیا گیا۔ اللہ معاف کرے ذاتی اغراض اور پارٹی بندی کی یہ آخری جنگ تھی، جس کی شرکت کا داغ آج تک دل میں ہے۔ میرے عزیز رفیق تقی الدین نعمانی بارہا کہتے "یہ کیا کر رہے ہو؟ یہ قوتیں کہاں ضائع ہو رہی ہیں" میں کہتا "بھائی" یہ آخری جنگ...... ہے...... ہمیں........... سے ندوہ کا انتقام لینا ہے۔"(۱)

....

نجد اور اس کے موجودہ امیر ...... کی زندگی اوروں کے لیے کتنی ہی جاذب ہو، لیکن راقم کو کوئی اور ہی چیز نجد لائی ہے، دو سو برس سے نجد کی زمین ایک عظیم الشان دعوت کا مرکز رہی ہے اور اس کے متعلق دنیا کی مختلف زبانوں میں موافق و مخالف لٹریچر کا ایک انبار موجود ہے۔ راقم کو اس دعوت سے دلچسپی تھی، اپنی طالب علمانہ زندگی کے دو تین اچھے اور اطمینان بخش سال اس کی نذر کیے اور اس تلاش و جستجو کا نتیجہ "محمد بن عبدالوہاب" کی صورت میں شائع ہو چکا ہے، لیکن اپنی پوری کوشش کے باوجود محمد بن عبدالوہاب کی زندگی کے بعض پہلو مزید روشنی کے محتاج رہ گئے، عرصے سے بلاد نجد کی زیارت کا شوق تھا، قصہ زمین برزمین کے طور پر حل طلب مسائل کو مقامی علماء کی مدد سے حل کرنے کو جی چاہتا تھا۔"(۲)

---

(۱) دیار عرب میں چند ماہ ص:۱۶

(۲) ایضاً ص: ۱۹۴

....

زندگی میں پہلی بار راقم کا عوام سے ربط "بشکل امیر الحج" ہوا ہے، اپنی صحت کی خرابی اور طالب علمانہ مذاق کے باعث دیہاتیوں میں کام کا موقع نہیں ملا، اس جہاز پر احساس ہوا کہ پنجاب میں پانچ سال رہنے کے باوجود پنجابی نہیں سمجھتا، جالندھر کی پنجابی تو بڑی آسانی کے ساتھ سمجھ لیتا، بلکہ بسا اوقات پنجابی تقریروں میں لطف بھی آتا تھا مگر یہاں پنجاب کے اضلاع اور خاص کر دیہاتوں کے رہنے والے جو بولی بولتے ہیں، ان سے راقم بالکل ناآشنا ہے۔"(۱)

....

کتاب زندگی کا نیا باب اکتوبر ۴۷ء سے شروع ہوتا ہے، نامرادیوں نے یہاں بھی ساتھ نہ چھوڑا، ناکامیوں سے اس راہ میں بھی دوچار ہونا پڑا، حوصلے اور منصوبے پورے نہ ہوئے اور تو اور عربی ماہنامے کی تجویز بھی ابھی تک عملی جامہ نہیں پہن سکی، صرف چھ پمفلٹ طبع ہو سکے ہیں۔ "غربة الاسلام في الهند" کا مسودہ دو برس سے ادھورا پڑا ہے، حج اور عالم اسلام کی سیاحت کا پروگرام ذاتی مجبوریوں کے باعث پورا نہ ہو سکا، تقسیم سے پہلے بالکل تیار تھا، ضروری زادراہ کا بھی اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے انتظام ہو گیا تھا مگر اس ٹریجڈی نے دنیا ہی بدل دی، بیس سال میں جو کچھ جمع کیا تھا، غالباً ردی کے نرخ فروخت ہوا ہو گا۔ وہ کتابیں اگر دوبارہ خریدی جائیں تو بھی وہ کام نہیں کر سکتیں ان کتابوں کا ایک ایک حرف پڑھا ہوا، حاشیوں پر یادداشتیں ان کے صفحے اور سطریں ایسی مانوس، گویا نگاہوں کے سامنے پھر رہی ہیں۔ یہ سطریں لکھ رہا ہوں اور حاضر العالم الاسلامی، الفتح کی جلدیں، ان کے خاص خاص مضامین اور ابواب نگاہوں کے سامنے چلتے پھرتے نظر آ رہے ہیں۔ کہنا یہ ہے کہ یہاں بھی دشواریاں پیش آئیں اور آ رہی ہیں،

---

(۱) دیار عرب میں چند ماہ ص: ۳۸۰

لیکن ضمیر مطمئن ہے، دوستوں اور رفیقوں سے اختلاف ہوتا ہے، مگر ذاتی غرض کے لیے نہیں، بعض مسئلوں میں رفیقوں سے الگ رائے ہوتی ہے، لیکن اس پر اصرار نہیں ہوتا، کام تھوڑا ہو یا بہت بس دعا ہوتی ہے کہ اللہ کے لیے ہو اور صرف اللہ کے لیے۔(۱)

مولانا موصوف کے سوانحی اشارے بھی ان کے خاص اسلوب میں ڈھلے ہوئے ہیں۔ جس میں حسن بیان کی سادگی بھی ہے اور پرکاری بھی، منظر کشی بھی اور جزرسی بھی، خطا و صواب کا برملا اظہار بھی، مگر بے لوثی اور خود غرضی سے پاک!

عقائد و نظریات

راقم کو اگر کوئی طنز سے وہابی کہتا ہے تو تردید کی ضرورت نہیں سمجھتا ہے، لیکن اگر کوئی اہل حدیث کے نام سے یاد کرے تو اس سے برات کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے۔ "اہل حدیث" سے تحزب اور گروہ بندی کی بو آتی ہے، بالکل ایسے ہی جیسے موجودہ دور میں حنفیت اور شافعیت وغیرہ فقہی مذہب ہونے کی جگہ مستقل "دین" بن کر رہ گئی ہیں۔ ہر طرف تحزب اور فرقہ بندی کا زور ہے۔ ضرورت اصول پر زور دینے اور فروع میں روادار ہونے کی ہے۔(۲)

....

آپ (۳) کو حیرت ہو گی میں یہاں آکر "عقیدۃً" زیادہ مولوی بلکہ ملّا ہو گیا ہوں مولانا سجّاد صاحب سے بارہا ملاحدہ اور دہریوں کی مخالفت اور سیاسی حوصلہ شکنی پر گفتگو آئی، ممکن ہے، دہلی کی نجی کانفرنس میں وہ اسے پیش بھی کریں۔"(۴)

....

---

(۱) دیار عرب میں چند ماہ ص:۱۶

(۲) ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک ص:

(۳) سیّد ابوالحسن علی ندوی کے نام ایک خط

(۴) پرانے چراغ ص:۳۴۳

بہر حال یقین رکھیے کہ میں یہاں جب تک رہوں گا ”ندویت“ مخصوص قسم کی، ”وہابیت“ اور ”عربیت“ پھیلا تا رہوں گا خواہ اس راہ میں شہید کیوں نہ ہو جاؤں۔(۱)

....

آج کل وادی نجد میں ٹھوکریں کھا رہا ہوں، اس بادیہ پیمائی کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ وہابیت اور زیادہ تلخ بلکہ دو آتشہ ہو گئی ہے، گو اب تک صرف لفظی وہابیت ہے، عمل سے محروم ہوں...... لفظ تصوف سے نفرت ذرا کم ہوئی، پر ابھی زبان سے اقرار نہیں، آپ کے سامنے یہ اقرار محض بہ سبیل اعتراف ہے۔(۲)

....

سوچ بچار کا یہ سلسلہ جاری ہے اور غالباً بصرہ تک جاری رہے گا۔ ہمارے بزرگ اس محاسبۂ نفس کو تصوف کی شاخ بتاتے ہیں اور فرماتے ہیں تم بھی عملاً تصوف کے قائل ہو، عاجز عرض کرتا ہے یہ تو آپ کے اختیار میں ہے، ہر اچھے فعل کو تصوف کا نام دے دیں اور پھر کہیں تم تصوف کے قائل ہو، ہم تو اس دجل و فریب سے برات کرتے ہیں جو آج عام طور پر تصوف کے پردے میں رونما ہوتا ہے، ہم ان بدعات کے منکر ہیں، جو تصوف کی راہ سے دین خالص میں داخل ہو گئی ہیں، باقی ”احسان“ اور تعلق باللہ کا کون کافر منکر ہوگا؟(۳)

....

سات آٹھ برس پہلے بڑی محبت اور عقیدت کے ساتھ امیر شکیب ارسلان کی کتابیں تلاوت کیا کرتا تھا، اب ان میں مزاج نہیں ملتا.................. دل کچھ اور ڈھونڈتا ہے، اب کہ عمر کا قافلہ چالیس کی سرحد عبور کیا چاہتا ہے اور چھ سات برسوں سے توجہات کا مرکز

---

(۱) پرانے چراغ ص: ۳۳۴

(۲) ایضاً ص: ۳۳۴

(۳) دیار عرب میں چند ماہ ص: ۱۶

اقامت دین کی تحریک ہے ان یکسر مادی چیزوں سے پیاس نہیں بجھتی، علم اگر دینی روح سے خالی ہے، تو وہ علم کس کام کا۔(۱)

....

بصرہ میں احباب نے گروپ تصویر کشی کی خواہش کی، اور بعضوں نے اس پر اصرار کیا، علماء عرب نے گو فوٹو پر اجماع کر لیا ہے .... دوستوں کے اصرار پر راقم نے بڑی نرمی سے عرض کیا "افسوس اس بات میں ہم لوگوں کو علماء مصر و شام کے اجتہاد سے اتفاق نہیں" سالم جلی نے بڑے دلائل دئے مگر انہوں نے اعتراف کیا کہ مجھے خود اس مسئلے میں انشراح نہیں، تو میں نے کہا دع ما یریبك الی مالا یریبك پر عمل کیجئے۔ آخر انہوں نے تجویز واپس لے لی۔(۲)

....

فروع میں راقم بھی ایک رائے رکھتا ہے لیکن اسے دوسروں پر تھوپتا نہیں، اور یہی توقع ہم دوسروں سے کرتے ہیں۔"(۳)

....

آج سفر مکہ کا آغاز ہے، صوفی اور تصوف زدہ حضرات اس مبارک سفر کے لیے عشق و محبت کا پیرایۂ بیان اختیار کرتے ہیں، راقم اپنی بے عملی اور گنہگاری کے باوجود سنت کا عاشق اور اتباعِ سنت کا دلدادہ ہے، فرسودہ اور رسوائے عالم جنونِ عشق اور پائمال وصل محبوب اور فراق لیلیٰ کا انداز بیان، اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی بارگاہ میں مجھے اچھا معلوم نہیں ہوتا، اپنا اپنا ذوق ہے، کسی کو رسول کریم ﷺ کی ذات گرامی کے لیے ابروئے پر نم، چشم سرمگیں اور کاکل پیچاں جیسی ترکیبیں اور فقرے استعمال کرنے میں لطف آتا ہے، راقم

---

(۱) دیار عرب میں چند ماہ ص:۴۷ (۲) ایضاً ص:۳۰

(۳) ایضاً ص: ۷۷ (۴) ایضاً ص:۲۲۱

کوان شاعرانہ ترکیبوں سے بے ادبی کی جھلک نظر آتی ہے۔ اسے وہابیت کہیے یا نجدیت ...... اس گنہگار کا ذوق یہی ہے۔"

عبدالرحمٰن الصدیق الملاح صاحب نے پھر رفع یدین نہ کرنے پر تنبیہ کی تنگ آکر راقم نے کہا "فروع میں جھگڑا ہمارا شیوہ نہیں، اور نہ میں اہلِ حدیث حضرات کا مقلد ہوں۔ براہ کرم ہمیں ان بحثوں سے معاف رکھیں۔"(۱)

....

راقم کا بھی عجب حال ہے، حنفی اور عام مسلمان کٹر وہابی، بلکہ اہل حدیث سمجھتے ہیں اور اہل حدیث حنفی۔"(۲)

....

اس نوجوان پر اس نوعمری میں جذب کا اثر معلوم ہوتا ہے .... کچھ کھوئے کھوئے سے نظر آتے ہیں، میں تصوف سے اس لیے ڈرتا ہوں، جو طریق تزکیہ جوانوں کو وقت سے پہلے بوڑھا بنادے۔ کم سے کم وہ جہاد کے لیے آدمی تیار نہیں کر سکتا۔(۳)

....

(مسجد نبویؐ میں) نماز کے بعد شباک نبویؐ جسے عام طور پر (مواجہہ شریفہ) کہتے ہیں، کے پاس مؤدبانہ قدم بڑھاتے ہوئے آیا .... علماء اور صوفیوں نے لمبے لمبے سلام ایجاد کر لیے ہیں پتہ نہیں یہ حضرات ابن عمرؓ اور امام مالکؒ سے بھی زیادہ عاشق رسول اور آداب محبت کے زیادہ اداشناس ہیں، ہمارے بعض مخلص دوست وہاں خراج عقیدت ادا کرنا ضروری خیال کرتے ہیں، لیکن کیا رسول اکرم ﷺ کے احسانات اور فضائل و محامد دس پندرہ سطروں کے سلام سے ادا ہو سکتے ہیں۔

---

(۱) دیار عرب میں چند ماہ ص:۱۴۵

(۲) ایضاً ص:۱۰۳

(۳) ایضاً ص:۳۵۹

ہم تو سنت رسول کے عاشق ہیں، اور جہاں سنت رسول نہیں، وہاں صحابہ کی سنت ہمارے لیے مشعل راہ ہے...... اور اس باب میں اکابر صحابہؓ ہی کا طریقہ صحیح اور قابل اتباع کہا جاسکتا ہے، جو مخلص عالم شدت محبت کے باعث ان امور میں تساہل برتتے ہیں، حقیقت میں وہ نادانستہ طور پر بدعات کا دروازہ کھولتے ہیں......... چنانچہ خاکسار نے ابن عمرؓ اور امام مالکؒ کے طریقے پر مختصر سلام پر اکتفا کیا۔(۱)

....

لیکن معتقداتِ دین کے باب میں میری روش الگ تھی، تصوف و سلوک و تزکیہ کے بارے میں عاجز نے مطالعے کے بعد اور اس انشراح صدر کے ساتھ ایک مسلک اختیار کیا ہے۔ اپنی طبیعت و مزاج کے لحاظ سے صرف امام ابن تیمیہ (ف ۷۲۸ھ) کی نکھری ہوئی توحید دل کو لگتی ہے، اور تو اور ابن قیم (ف ۷۵۱ھ) کے ہاں بھی اس باب میں کمزوری محسوس ہوتی ہے۔ اس لیے حضرت سیّد صاحب کی صحبتوں اور مکاتیب سے استفادہ کے باوجود راقم اپنے مسلک پر قائم رہا۔"(۲)

....

یہ واقعہ بھائی جان (مسعود عالم ندوی) نے ہم سے بارہا بیان کیا کہ ندوہ کے زمانے میں ایک مرتبہ علی میاں مجھ پر بہت اصرار کرنے لگے کہ کسی کے ہاتھ پر بیعت کرلوں، مگر میں اس کے لیے تیار نہ ہوتا تھا، ایک دن جو انہوں نے بہت تنگ کیا، تو میں نے ہاں کرلی۔ علی میاں بہت خوش ہوئے اور پوچھنے لگے کہ کس کے ہاتھ پر؟ میں نے جواب دیا کہ آپ کے! کیوں کہ جن لوگوں کے ہاتھ پر آپ مجھ سے بیعت کرانا چاہتے ہیں، ان میں سے کسی کو میں آپ سے زیادہ متقی نہیں سمجھتا۔ یہ سن کر علی میاں لاحول پڑھنے لگے۔(۳)

....

(۱) دیارِ عرب میں چند ماہ ص: ۳۱۲

(۲) مکاتیب سلیمان ص:

(۳) چراغِ راہ، مسعود عالم ندوی نمبر، ص: ۹۷

عقائد و نظریات کے معاملہ میں مولانا بہت صاف ذہن تھے، ان کا ذہن تحزب اور مسلکی گروہ بندی سے آزاد تھا، اس لیے ضرورت کے وقت وہ اصول دین پر زور دیتے تھے، اور فروع کے معاملہ میں رواداری تھے، اور اگر انہیں ناز تھا تو اپنی سلفیت، ندویت اور ملاءیت پر تھا، اس لیے وہ کسی طعنہ ظن کے طعنہ سے متاثر نہ ہوتے تھے، تصوف کے دلدادہ نہ تھے مگر محاسبہ نفس سے محروم بھی نہ تھے، ایسا علم جو روح دین سے خالی ہو انہیں ناپسند تھا وہ رسمی طور پر کسی آستانہ تصوف سے وابستگی نہ رکھتے تھے۔ اس لیے کسی سے بیعت نہ ہوئے، اور نہ علی میاں کی ترغیب کام آئی، انہیں صرف تحریک اقامت دین پسند تھی، اور اس سے وابستگی ہی ان کا علمی تقاضہ، فوٹو گرافی کو ناجائز جانتے تھے اور خدا ورسول کے معاملے میں مبالغہ آرائی، شاعرانہ تخیل و تراکیب عاشقانہ سے نہ کام لیتے تھے اور نہ اس معاملے میں انہیں ابن تیمیہ کے سوا ابن قیم کی طرز ادا پسند تھی، اس لحاظ سے ان کا تفرد اوروں سے مختلف و منفرد اور ان کے فکر و فن کی الگ پہچان!

اخلاق و سیرت

ہم نے ہندوستان اور پاکستان میں کبھی رشوت نہیں دی ...... مگر اس پاک سر زمین پر ایک دفعہ یہ معصیت بھی کرنا پڑی، اے اللہ! تو بہتر جانتا ہے، یہ کمزور و ناتواں مجبور تھا اور بے بسی محسوس کرتا تھا اب تیرے عفو کا طلب گار اور تیری رحمت کا بھروسہ ہے۔ (۱)

....

عرصے کے بعد والد ماجد مدظلہ کا گرامی نامہ ملا، کراچی چھوڑ دینے کے بعد یہ پہلا خط ہے، اس دوران میں تشویش رہی، خط سے اندازہ ہوا کہ تشویش ٹھیک ہے، دو ماہ بستر علالت پر دراز رہنے کے بعد اب دو سطریں لکھنے کے قابل ہوئے ہیں .... یہ ان کی طبیعت ہے، بارہا ایسے حالات پیش آئے ہیں، لیکن مجھے وقت گزر جانے کے بعد اطلاع

---

(۱) دیارِ عرب میں چند ماہ ص: ۳۴۹

ہوئی، میری صحت کے پیش نظر انہوں نے اپنا یہ معمول بنالیا ہے۔ مگر مجھ پر کیا گزرتی ہے، اس کا حال اللہ ہی بہتر جانتا ہے، کل سہ پہر بڑا حصہ اسی تاثر میں گزرا، بہر حال اللہ کارساز ہے، ہمارا کام تو کچھ بھی نہیں، لیکن الحمد للہ نیت خالص اور ارادے بلند ہیں۔ (۱)

میری زندگی میں اب تک اس سے بڑی اور کوئی آزمائش نہیں آئی، ایک طرف اپنا عقیدہ اور مسلک جسے پورے انشراح اور اطمینان قلب کے ساتھ اختیار کیا تھا، دوسری طرف استاد مرحوم (علامہ سیّد سلیمان ندوی) کے تعلقات۔

میں نے گزشتہ بارہ سالوں میں جس طرح ان دونوں کے نباہنے کی کوشش کی ہے اور اس کے لیے جو جو جتن کرنا پڑے ہیں۔ انہیں اللہ ہی بہتر جانتا ہے...... مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ اس خادم کی وفاشعاری کا ان پر آخر وقت تک اثر رہا۔ یہ اللہ کا فضل ہے۔ (۲)

....

اہل علم و ارباب نظر حضرات سے درخواست ہے کہ وہ حقیر کی کوتاہیوں اور لغزشوں پر متنبہ کرنے میں مطلق تامل نہ فرمائیں۔

یہ راقم اپنی طالب علمانہ حیثیت اور کم علمی سے خوب واقف ہے، ہر مفید مشورہ شکریہ کے ساتھ قبول کیا جائے گا اور تو اور معاندانہ تنقیدوں سے بھی کام کی بات مل سکی، تو اظہار اطمینان کے ساتھ اخذ کی جائے گی۔ (۳)

....

جو شخص اپنی خوبیوں اور خامیوں سے خود واقف ہو، اور طبیعت وفاشعار بھی ہو، اور معاندانہ تنقید کی پرکھ بھی رکھتا ہو وہی ہمیشہ اخذ و استفادہ جاری رکھ سکتا ہے۔ بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کے چھوٹے سے چھوٹے پیرے میں بھی کام و نقد کی کوئی نہ کوئی بات آپ کو مل جائے گی۔

---

(۱) دیار عرب میں چند ماہ ص ۱۶۶ (۲) مکاتیب سلیمان ص: ۱۲۲

(۳) ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک ص: ۹

”آج نظریہ سیاسی کی قرأت کے دوران میں ایک بات ہماری انتہائی شرمندگی کا باعث ہوئی، سورہ مومنون کی دو آیتوں میں تعملون کے بجائے ”مومنین“ چھپ گیا ہے، غلطی جس کی بھی ہو، ذمہ داری یکسر میری ہے، اللہ تعالیٰ معاف فرمائے...... دو تین زبان کی فاش غلطیاں بھی نکلیں، جو متوقع نہیں تھیں .... گو نظریہ سیاسی کا ترجمہ راقم کا نہیں، لیکن تصحیح و نظر ثانی عاجز ہی نے کی ہے، اس لیے ذمہ داری بہر حال اس گناہ گار کی ہے۔“(۱)

”راقم اپنی صحت اور ذوق کے لحاظ سے امیر الحج کی ذمہ داریوں سے الگ ہی رہنا چاہتا تھا۔ مگر جب یہ ذمہ داری ڈال دی گئی ہے، تو اسے کماحقہ پورا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں .... دوڑ دھوپ میں کوتاہی نہیں کرتا، صبح سے شام تک شکایتیں سنتا رہتا ہوں اور ان کے تدارک کی ممکن کوشش سے باز نہیں آتا۔“(۲)

آخر کے یہ دو پیرے مولانا کی زندگی کو ایک کھلی کتاب کی طرح پیش کرتے ہیں، کیوں کہ کوتاہی اور ذمہ داری دونوں کو وہ خوب سمجھتے تھے۔

عشق رسول ﷺ

مدتیں گزریں، زمانہ بیت گیا، مدینہ کی حاضری کا شوق دل میں چٹکیاں لیتا رہا، بارہا فرط شوق میں آسی غازی پوری کا یہ پر کیف مطلع پڑھتا رہا ہوں ؎

صبا تو جا کے یہ کہیو میرے سلام کے بعد
کہ تیرے نام کی رٹ ہے خدا کے نام کے بعد

وہ کیا ساعت ہو گی جب یہ گناہگار روبرو حضرت عالی میں سلام عرض کرے گا، جب کبھی یہ خیال آتا، آنکھیں پر نم ہو جاتیں، درود پڑھتا اور عربی اردو کے مناسب حال شعر زبان پر جاری ہو جاتے .... اب یہ گنہگار ہمہ تن شوق ہے، وہابیت کی خشکی کے باوجود دل پسیج رہا ہے، جانے ان راستوں سے حضور انور ﷺ کا بھی گزر ہوا ہو، موثر نہ

---

(۱) دیار عرب میں چند ماہ ص: ۱۰۱

(۲) دیار عرب میں چند ماہ ص: ۳۸۳

ہوتی تو گرد راہ سے پوچھتا، شاید نقش پا کے کھوئے ہوئے اثرات کا سراغ لگتا۔ شاعر کی زبان میں محبوب کے گزرنے سے تمام وادی نعمان معطر ہو گئی تھی۔

تضوع مسکا بطن نعمان اذ مشت
بھا زینب فی نسوۃ عطرات

تو کیا سرور عالم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی گزرگاہ میں ہوائیں مشک آفریں اور عنبر بیز پسینے کی خوشبو سے خالی ہوں گی۔(۱)

مدینہ کی پاک سرزمین قریب ہوتی جا رہی ہے، اور خاکسار کھانسی کے حملوں سے چور، کھویا ہوا، گنگناتا اور درود پڑھتا چلا جا رہا ہے، موٹر میں تیس تیس مسافروں میں سب کے سب حج سے فارغ ہو کر مدینۃ الرسول ﷺ کی زیارت کو جا رہے تھے، لیکن کہیں گداز و شوق کا نام نہیں، وہی باتیں، وہی خوش گپیاں، دل ہی دل میں کڑھتا مگر کرتا کیا؟ اپنے دل کا جائزہ لیتا، وہ بھی پتھر نظر آتا، رسول کریم ﷺ سے محبت کے دعوے خالی خولی معلوم ہوتے ہیں، اپنے متعلق تو رائے زنی کی جا سکتی ہے، دوسروں کے ساتھ کیوں بدگمانی سے کام لیا جائے۔

اتنے میں شور ہوا کہ ذوالحلیفہ جسے آباد علی، بھی کہتے ہیں، آگیا، یہ سن کر دل بلیوں اچھلنے لگا.......... دل چاہا کہ غسل کر کے کپڑے بدل لیے جائیں اور یہاں سے پیدل چلیں، مگر کھانسی اور اس پر حرارت نیز کمزوری حد سے بڑھی ہوئی، ہمت نہ پڑی، عرصے سے تمنا تھی کہ مدینہ میں پاپیادہ داخل ہوں امام مالکؒ مدینہ منورہ میں سواری استعمال نہ کرتے تھے، کہتے جہاں رسول کریم ﷺ کی قبر ہے اس زمین کو کسی جانور کی ٹاپوں سے روندنا حرام سمجھتا ہوں، عربی کا ایک دل آویز شعر بڑے ذوق و شوق سے پڑھا کرتا تھا۔

واذا بلغن بنا المطی محمدا
فظھورھن علی الرجال حرام

مگر جب اس تمنا کے پورا کرنے کا وقت آیا تو مرض نے بے بس کر دیا، وائے ناکامی،

---

(۱) دیار عرب میں چند ماہ ص: ۳۱۲

عاصم صاحب سے رائے طلب کی، صرف کپڑے ہی بدل لیے جائیں۔ گرد و غبار کی وجہ سے ان کی رائے نہ ہوئی آخر صبر کر کے بیٹھ رہا، لیکن دل کے اندر سے ایک آواز آرہی تھی۔

نگاہیں فرش راہ ہوں حمید سر کے بل چلو
ادب، ادب، یہ کوچہ حبیب کرد گار ہے

مگر سنے کون؟ مسعود بے نواتو کھانسی سے چور قہوہ خانے میں بیٹھا ہوا اپنے ساتھیوں کو امید بھری نظروں سے دیکھ رہا ہے، ایک قہوہ خانے میں چائے پی، اور پہلی بار مدینہ کے انگور کھائے، انگور اچھے اور لذیذ تھے، شوق محبت نے انہیں اور لذیذ بنادیا، عجیب وسوء اتفاق کہ اس بد بخت قافلے میں کسی نے غسل کیا نہ کپڑے بدلے نہ پیدل ہی چلنے کی ہمت کی۔ (۱)

....

طائف کی سڑکوں اور بازاروں سے گزرے، لاریاں اور ٹرک بھر بھر کر حجاج کو لے جارہے تھے، نگاہیں شہر کی عمارتوں پر تھیں، لیکن دل جذبات شوق سے معمور، ایک ایک پتھر اور ایک ایک اینٹ کو شوق اور تجسس کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا کیا یہ وہی طائف ہے جس نے حضور ﷺ کی دعوت ٹھکرادی تھی؟ کیا یہ وہی پہاڑیاں اور دشوار گزار گھاٹیاں ہیں، جہاں حضرت محمد ﷺ کے قدم مبارک لہولہان ہوئے تھے، موٹر دو متوازی پہاڑی سلسلوں اور پر پیچ گھاٹیوں سے ہو کر جارہی تھی، اور گنہگار بار بار دل میں کہتا:

یہ راستہ تو موٹر سے روندنے کے قابل نہیں، ہم اپنے آپ کو داعی کہتے ہیں، تو پھر کیوں سب سے بڑے داعی حق کے نقش قدم پر چلنے کی ہمت نہیں کرتے، یہی راستہ تھا، یہی گھاٹیاں ہوں گی، سرزمین یہی تھی، پہاڑیاں یہی تھیں، اب بھی وہی زمین ہے پہاڑیاں بھی وہی ہیں لیکن پاک باز کے نقش قدم پر چلنے والے راہ حق کے دیوانے کہاں ہیں۔" (۲)

....

---

(۱) دیار عرب میں چند ماہ ص: ۳۱۲

(۲) ایضاً ص: ۱۹۰

ابتدائی تاریخ اسلام میں .... حضرت حمزہؓ کی شہادت سے زیادہ کوئی دوسرا واقعہ راقم پر اثر انداز نہیں ہو سکا ہے۔ جب کبھی حضرت حمزہؓ کی شہادت کا واقعہ نظر سے گزرا، اپنی سنگ دلی کے باوجود آنکھیں پر نم ہو گئیں...... جب حضرت حمزہؓ کی قبر پر حاضر ہوا، تو آنسو خشک ہو چکے تھے، دل پر اثر تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بڑھاپا طاری ہو گیا ہے، چھڑی کی ٹیک لی۔ (۱)

....

مدینہ منورہ میں آج ہمیں دو ہفتے ہو جائیں گے .... جی چاہتا ہے سال دو سال یہیں رہ جاؤں، جماعت سے وابستگی، ذمہ داری اور بوڑھے شفیق باپ (اللہ ان کا سایہ سر پر قائم رکھے) کی خدمت کی حاضری کا خیال نہ ہوتا، تو شاید سال بھر کے لیے ابھی نیت کر لیتا۔ (۲)

....

کشاں کشاں بارگاہ نبوت کی طرف گیا، اپنی جرات پر نازاں اور بادشاہوں کے درباروں میں بے محابا جانے والا، یہاں ششدر اور مبہوت تھا، کیا کرے اور کیا عرض کرے، قدم حدود نبوت سے آگے نہ بڑھنے پائے .... زبان السلام علیك یا رسول اللہ والسلام علیك ایھا النبی و رحمة اللہ و برکاته سے زیادہ نہ کہہ سکی، بڑی ہمت کی تو ماثور درود پڑھ کے آگے بڑھ گیا۔ (۳)

مذکورہ سطور کو پڑھ کر صاف یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہابیت، کی خشکی کے باوجود ان کے قلم سے ان کا شوق محبت یا جذبات کا شوق کہیں آنکھیں پر نم کرتا ہے، تو کبھی مدینہ میں قیام کی تمنا، والد کی یاد، جماعتی ذمہ داری کا احساس سب کچھ درون دل میں موجود پا کر بارگاہ نبوت میں کھڑا شریعت مطہرہ کا پورا لحاظ و خیال رکھے ہوئے ہے۔

بلاشبہ ایسے جذباتی موقع پر بھی ان کا قلم سنبھل سنبھل کر چلا ہے، جو ان کی صلابت فکر پر دال ہے، محض مجرد خوش عقیدگی نہیں۔ گویا حلم کا اعتدال و توازن یہاں

---

(۱) دیار عرب میں چند ماہ ص: ۳۲۹ (۲) دیار عرب میں چند ماہ ص: ۳۳۲

(۳) ایضاً ص: ۳۲۸

بھی برقرار ہے۔

عجز وانکسار

کچھ دیر بعد طٰہٰ نیاض "ایڈیٹر السجل" اور ان کے دوست جعفر مال اللہ تشریف لائے، مجھ سے حالات زندگی دریافت کیے، اپنے اخبار میں میرا تعارف کرانا چاہتے ہیں، عاجز نے صفائی سے کہا، میری کوئی زندگی نہیں، اور نہ سوانح حیات قابل ذکر ہیں، بس ایک طالب علم کی زندگی بسر ہو رہی ہے، اس کے بعد تصویر کی فرمائش ہوئی، میں نے اپنا مسلک بتا دیا............

طٰہٰ فیاض بولے، سیّد رشید رضا جیسے عالم اور محدّث بھی تصویر کے جواز کے قائل ہیں، میں نے کہا واقعی یہ تعجب کی بات ہے، ان کے علم و فضل کا مجھ سے زیادہ کون معترف ہو گا، لیکن فوٹو کے متعلق جواز کی کوئی شکل سمجھ میں نہیں آتی۔ (۱)

....

البلاد السعودیة کے ایڈیٹر سے ملاقات کی .... انہوں نے فوراً ہی تازہ اشاعت میں راقم سے متعلق ایک خبر لکھ کر پریس کو دے دی، عاجز نے ان پر ظاہر کر دیا، کہ ہم چھپنے کے شائق نہیں، ہماری خواہش یہ ہے کہ آپ ان رسالوں کو پڑھ کر ان پر لکھیں، انہوں نے ریویو کا پختہ وعدہ کیا۔" (۲)

شیخ عبدالعزیز قاضی نے مزید پوچھا "حدیث میں کیا پڑھا ہے" اور کن اساتذہ سے؟ اساتذہ کی حد تک تو اس گنہگار کے پاس بڑے بڑے نام ہیں مگر اساتذہ کی بڑائی سے نالائق شاگرد کی عزت تو نہیں بڑھ جاتی۔ (۳)

---

(۱) دیار عرب میں چند ماہ ص: ۷۳

(۲) ایضاً ص: ۳۶۴

(۳) ایضاً ص: ۲۱۵

کل سے دو گھنٹے تک جہاز کا لاؤڈ اسپیکر ہمارے تصرف میں رہے گا، پر اس سے فائدہ کون اٹھائے، میں تو تنفس اور لکنت کی وجہ سے تقریر نہیں کرتا۔"(۱)

....

شنقیطی صاحب "ام القریٰ" کا تازہ پرچہ لائے، اس میں اہل قلم اور ارباب صحافت حجاج کا تذکرہ ہے، راقم کا بھی کسی صاحب نے ذکر کیا ہے، اسی لیے وہ اخبار لائے تھے، الحمد للہ ہم لوگ چھپنے چھپانے کی منزل سے آگے بڑھ چکے ہیں، اقبال کا ایک شعر اس سلسلے میں ہمیشہ یاد آتا ہے ؎

جینا وہ کیا جو نفس غیر پر مدار
شہرت کی زندگی کا بھروسا بھی چھوڑ دے (۲)

صالح انسان میں جہاں خیال ورائے کی پختگی پائی جاتی ہے۔ وہیں عجز وانکسار بھی، شہرت اسے ناپسند ہو جاتی ہے، اور اساتذہ کی بڑائی کو وہ شاگرد کی بڑائی نہیں سمجھتا "من آنم کہ من دانم" اس کا مسلک ہو جاتا ہے، اور اس کی چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی اس کی نجی زندگی کا حسن ٹپک پڑتا ہے، مولانا کی زندگی کا ایک وصف یہ بھی ہے۔

دینی غیرت وحمیت

عصر کے بعد بادشاہ سلامت کی آمد تھی .... عاصم صاحب دوڑتے ہوئے آئے اور بولے چلیں، بادشاہ طواف کرے گا، میں نے کہا میاں جاؤ اور ان کی زیارت کرو، راقم اس تماشہ بینی سے باز آیا۔ یوں بھی طبیعت کچھ پژمردہ ہے۔ میں نے کہا راقم نے کب کسی کی تقلید کی ہے؟ سیّد صاحب قبلہ کا ادب واحترام اپنی جگہ پر لیکن ابن سعود کا جلوس فوج اور پولیس کے جلو میں اس کا طواف دیکھنے حرم جاؤں، یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا۔"(۳)

---

(۱) دیار عرب میں چند ماہ ص: ۷۳

(۲) دیار عرب میں چند ماہ ص: ۲۹۵

(۳) ایضاً ص: ۲۴۹

راستے میں اہل وطن حجاج پھلواری کی خدمت میں حاضر ہوا، پھلواری کے سجادہ نشین ایک بڑے قافلے کے ساتھ حج کے لیے تشریف لائے ہیں .... راقم حاضر ہوا، تو وہاں پیری کا دربار نظر آیا.......... ان کے چچازاد بھائی ...... بار بار کہتے رہے، ابھی حضور مصروف ہیں۔ میں نے کہا جب حضور مصروف ہی ہیں تو عاجز رخصت ہوتا ہے۔(۱)

....

سلطان کے دائیں جانب ایک کرسی چھوڑ کر بیٹھا، ابن سعود پر ضعیفی طاری ہو چکی ہے، چہرے پر جھریاں پڑی ہوئیں، اور ضعف کے آثار نمایاں، دبی آواز سے حال دریافت کیا (کیف حالک) رسمی طور پر علیک سلیک کے سوا اور کسی گفتگو کی توقع نہیں تھی، مدح اور ستائش کے الفاظ میری زبان سے نکلنا مشکل، اور کسی تنقید و تبادلۂ خیال کے لیے سلطان اور اس کے مصاحب تیار نہیں۔ بس سکوت کے عالم میں ایک آدھ گھنٹہ بیٹھا رہا، اتنے میں ہمارے رہنما نے اشارہ کیا اور السلام علیکم کہہ کر راقم پہلے دروازے سے نکل گیا۔(۲)

....

عبدالرحمٰن مظہر صاحب سے معلوم ہوا کہ مولانا سیّد سلیمان ندوی مدظلہ ...... قریب ہی بھوپال کے رباط میں قیام پذیر ہیں، ساتھ ساتھ مشورہ بھی دیا کہ وہیں ٹھہر جاؤ، سیّد صاحب ایک آدھ کمرہ دلوادیں گے، میں نے ان سے صفائی کے ساتھ عرض کیا، کسی کے کہنے اور زبان کھولنے کے لیے تو بندہ تیار نہیں، ہاں! اگر پیش کش ہوئی تو اور بات ہے۔(۳)

....

عبدالحمید خطیب (۴) نے تو اپنی عنایت و محبت سے ہمارے آرام و آسائش کا ہر ممکن انتظام

---

(۱) دیار عرب میں چند ماہ ص:۲۵۳

(۲) دیار عرب میں چند ماہ ص:۱۹۸

(۳) ایضاً ص:۲۳۴ (۴) پاکستان میں متعین سعودی عرب کے اس وقت کے سفیر

کر دیا تھا، مگر ہماری طبیعت ولی عہد اور بادشاہ کے دربار میں حاضری کے لیے تیار نہیں تھی، صرف علماء سے ملنا مطلوب تھا۔(۱)

....

ہمارے مخلص دوست اور بھائی علی میاں نے نصیحت کی تھی............

حجاز میں اپنی عادت کے مطابق زیادہ باتیں نہ بنانا، ورنہ حج وعمرہ کے بدلے جہاد کا ثواب ملنا شروع ہو جائے گا، لیکن بگڑی ہوئی عادتیں ایک آدھ نصیحت سے کہاں سدھرتی ہیں، راقم نے تو کبھی احتیاط نہیں برتی، حج وعمرہ کے ساتھ جہاد کا ثواب ملنا شروع ہوا یا نہیں، یہ اللہ بہتر جانتا ہے، باقی اس گنہگار نے جہاد کا ثواب حاصل کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ہے۔(۲)

....

آخر سوچ بچار کے بعد ولی عہد کے نام ایک رقعہ لکھا اور معمولی القاب کے ساتھ، راقم نے رقعے میں یہ بھی تصریح کر دی کہ ہم کچھ چاہتے نہیں، صرف کرایہ دے کر ہوائی جہاز یا ٹیکسی میں دو نشستیں مطلوب ہیں، یہ حضرات اس طرز خطاب کے عادی نہیں، ان کے ہاں صرف تملق اور جھوٹی تعریفیں کرنے والے مقبول ہیں...... بعض ملنے والوں نے منع بھی کیا کہ کرائے کا ذکر نہ کرو، اسے وہ اپنی توہین خیال کریں گے، میں نے عرض کیا، انشاء اللہ زیادہ سے زیادہ مہذب اور شائستہ الفاظ میں ذکر کروں گا، لیکن اس کی تصریح ضروری ہے، خوشامدی اور مصاحب قسم کے لوگوں سے اپنے آپ کو الگ کرنا ضروری خیال کرتا ہوں۔(۳)

عید میں تزاور، مسنون ہے، لیکن ہم اس نعمت سے محروم ہیں، جالندھر والے بھی اس کے عادی نہیں تھے، راولپنڈی میں ہمارا حلقہ جماعت کے افراد تک محدود تھا

---

(۱) دیار عرب میں چند ماہ ص:۱۹۶

(۲) دیار عرب میں چند ماہ ص:۳۰۲

(۳) ایضاً ص:۲۰۹

.... یہاں تعارف تو خاصا ہو چکا ہے، لیکن ظاہر پرستوں کے ہاں شان و شکوہ کی ضرورت ہے۔ اور یک طرفہ زیارت پر طبیعت کبھی آمادہ نہیں ہوئی، تبلیغ حق یا اہل علم و فضل کے ہاں استفادہ کے خیال سے سو بار جانا منظور ہے، لیکن اہل جاہ کے دروازے پر حاضری دینا، اس گنہگار کے بس کی بات نہیں۔(۱)

....

راستے میں شیخ عبداللہ الحسو کے ہاں حاضری دی، یہ عجیب و غریب آدمی ہیں، پہلے خوش عقیدہ یا عام اصطلاح میں بدعتی تھے اب کٹر وہابی ہیں .... اور سب سے الگ تھلگ توبہ و استغفار کرتے رہتے ہیں، راقم کو ان کے خیالات کا علم تھا........... آخر میں اسلامی دعوت اور اس کے اصول مفصل طور پر بیان کرنے کے بعد راقم نے سوال کیا "خطابت اور امامت کی نوکری کے باب میں سلفیت کیا کہتی ہے؟ بے چارے چپ ہو گئے اور کہنے لگے "کوئی دوسرا ذریعہ معاش نہیں، میں نے عرض کیا، مسجد کے دروازے پر جوتا گانٹھئے یا آنہ گلاس شربت بیچئے اور نماز کے وقت امامت کیجئے۔ پھر دیکھئے آپ کے خطبوں میں کتنی تاثیر ہے۔ بولے یہ تو مشکل کام ہے، اور طبیعت آرام کی عادی ہے، میں نے عرض کیا، تو پھر اتباع سنت کا نام نہ لیجئے، بات تو بہت تلخ تھی، لیکن تیر نشانے پر بیٹھا، شیخ خاموش ہو گئے اور دوسری ملاقاتوں میں بھی خاموش ہی رہے۔(۲)

مولانا کے مزاج میں اہل جاہ سے اجتناب، تملق اور مداہنت نہ تھی، دینی غیرت و حمیت ان کی زندگی کا بڑا وصف تھا، جس کا اظہار ان کی تحریروں میں بدرجہ غایت موجود ہے۔ آپ یوں بھی کہہ سکتے ہیں حق گوئی اور بے باکی ان کی بڑی صفت تھی، روباہی اور خوشامد ان کا شیوہ نہ تھا۔ گویا اظہار خیال میں اسد اللہ تھے۔

....

---

(۱) دیار عرب میں چند ماہ ص: ۱۲۷

(۲) ایضاً ص ۱۴۲۔۱۴۴

تنقید نگاری

ہم ان نظریوں کی تنقید و تنقیح پر مجبور ہیں جو کتاب و سنت کے صراط مستقیم سے ہٹے ہوئے ہیں، خواہ اس میں جذبات محبت و عقیدت ہی کو کیوں نہ ٹھیس لگتی ہو کہ حق کی تائید تعلقات و محبت کی پاسداری پر مقدم ہے۔"(۱)

تیسرے پمفلٹ میں مصنف (۲) نے الاخوان المسلمون والوں سے باتیں کی ہیں یہ باتیں اچھی، معقول اور دل نشیں انداز میں کی گئی ہیں، مگر توقع کے خلاف ژولیدگی فکر یہاں اور نمایاں ہے، مصر میں اقامت دین کے علمبرداروں کو لائق مصنف یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ حکومت اور نظام حکومت کے قیام کا مطالبہ اسلام میں مطلوب و مقصود نہیں، حکومت تو اللہ کی طرف سے انعام ہے، یہ طلب نہیں کی جاتی، کہنا یہی چاہتے ہیں مگر کہتے ہوئے ڈرتے بھی ہیں، اس لیے ان کے بیان میں تضاد رونما ہو گیا ہے، ایک طرف تو وہ کہتے ہیں کہ حکومت طلب نہیں کی جاتی۔ یہ نتیجے کے طور پر خود بہ خود ظہور میں آتی ہے، جیسے ایک درخت اپنے وقت پر پھل دینا شروع کر دیتا ہے، پھر آگے چل کر فرماتے ہیں، لیکن دعوت کے کسی مرحلے میں، دعوت کے پھیل جانے اور دل و دماغ میں جاگزیں ہونے کے بعد ـــــ اگر یہ کام حکومت کے بغیر ناممکن ہو تو ہم دعوت اور دین کی خاطر اس کے لیے جدوجہد کریں گے، جیسے وضو کے لیے پانی کے حصول کی جدوجہد کرتے ہیں، لیکن اسی ذہنیت اور اسی کردار اور پاکیزگی اخلاق کے ساتھ ...... الخ (۳)

....

پچھلے چند برسوں میں جن صاحبوں نے سیّد شہید اور ان کے ماننے والوں پر کچھ

---

(۱) مولانا سندھی اور ان کے افکار و خیالات پر ایک نظر ص: ۵

(۲) مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی کی ذات گرامی مراد ہے۔

(۳) ترجمان القرآن جلد نمبر ا، بحوالہ چراغ راہ ص: ۱۹۹

لکھا ہے ان میں مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم و مغفور (ف ۱۳۶۳ھ) اور مولانا ابوالحسن علی ندوی قابل ذکر ہیں .... (مولانا سندھی) نے حزب ولی اللہ کی تشکیل اور من مانی توجیہہ کی خاطر سیّد صاحب کے ماننے والوں اور خاص کر اہل صادق پور پر بڑا ظلم کیا ہے اور ان کی کمزوریوں کی تنقید و مذمت میں ان کا قلم اعتدال پر قائم نہیں رہ سکا ہے، راقم نے ان کی زندگی ہی میں اس کتاب پر تنقید کی تھی۔"(۱)

....

مولانا ابوالحسن علی ندوی کی کتاب (سیرت سیّد احمد شہیدؒ) سیّد صاحب کی سوانح، ان کی تعلیمات اور مشن پر بے مثال کتاب ہے .... مگر افسوس کہ میرے عزیز ترین دوست اور مخلص بھائی کا طریق فکر و نظر خالص عقیدت مندانہ ہے، اور انہوں نے بزرگوں کی کوتاہیوں اور فروگزاشتوں سے نگاہ بچا کر نکل جانے کی کوشش کی ہے۔ راقم کی روش ان دونوں اصحاب علم و فضل کے مقابلے میں بین بین کی سی رہی ہے۔

یہ گنہگار سیّد صاحب کی تحریک تجدید و جہاد کو ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک سمجھتا ہے، اور مولانا سندھی کی طرح ان کی دعوت کو کسی اندرونی یا بیرونی تحریک کا ضمیمہ نہیں خیال کرتا .... دوسری طرف جیسا کہ زیر نظر صفحات کے مطالعے سے واضح ہوگا، سیّد صاحب یا ان کے اصحاب خاص کو معصوم بھی نہیں سمجھتا، نیز مستقبل میں ماضی کی غلطیوں سے بچنے کے لیے پچھلی فروگزاشتوں کی نشاندھی ضروری خیال کرتا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ طریق فکر بہت کم لوگوں کو خوش کر سکے گا، اور بہت ممکن ہے کہ اس کی مخالفت میں آوازیں بھی بلند ہوں، ان خطرات کو محسوس کرتے ہوئے بھی اس گنہگار

---

(۱) ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک ص:۹

نے جا بجا جائز اور بے لاگ تنقید کرنے کی جرأت کی ہے اور یہ صرف اس خیال کے ماتحت کہ حق بات کڑوی معلوم ہوتی ہے، اور اگر کوئی پائیدار لٹریچر اور صالح فضا تیار کرنا ہے تو پھر پسند عام کی خاطر حق کے اظہار میں تامل نہ ہونا چاہیے۔"(۱)

....

امابعد! آخر ماجرا کیا ہے، تنقید و تحسین میں آخر برا ماننے کی کیا بات ہے، جہاں تک فکر و رائے کا تعلق ہے، دوستوں کے درمیان اختلاف قابل برداشت ہونا چاہیے۔(۲)

....

مگر جب خود اپنی جماعت کے ممتاز اصحاب فکر ان نفوس قدسیہ کے منہ آئیں، ان کی پاک نیتوں پر حملے کریں، ان کے ضرب المثل اخلاص پر شکر کریں، تو پھر خواہ مخواہ صبر و تحمل کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے لگتا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ یہ وقت بڑی آزمائش کا ہوتا ہے۔ ایک طرف یہ خیال کہ بزرگوں کی غلطیوں پر نکتہ چینی بے ادبی نہ شمار کی جائے عرض مدعا سے روکتا ہے دوسری طرف احساس فرض .... اظہار مطلب پر اکساتا ہے۔"(۳)

مسعود صاحب کی مذکورہ عبارتوں سے واضح ہوتا ہے کہ موصوف کا معیار تنقید اسلامی تھا۔

●●

---

(۱) ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک ص:۱۰

(۲) پرانے چراغ ص:۳۵۲

(۳) مولانا سندھی اور ان کے افکار و خیالات پر ایک نظر ص:۳

باب پنجم

مولانا مسعود عالم ندوی
خطوط کے آئینے میں

مولانا مسعود عالم ندوی

خطوط کے آئینے میں

مکتوب نگاری باضابطہ ایک فن کا نام ہے، دنیا کے بہترین مکتوب نگار اکثر وہی لوگ ہوئے ہیں، جن کی زندگی کا کوئی اہم مقصد تھا، اور ان کے خطوط ان کے مقاصد کی روداد بیان کرتے ہیں۔ خطوط نگاری کے متعدد اقسام ہیں: مذہبی اور سیاسی نوعیت کے خطوط، تنقیدی اور ادبی نوعیت کے خطوط، ذاتی اور نجی زندگی کے متعلق خطوط۔

نبی کریم ﷺ نے خطوط کے ذریعہ بادشاہوں اور سربراہوں کو اسلام کی دعوت پہنچائی، سربراہان حکومت نے خطوط کے ذریعہ اپنی حکومت چلائی، ان کے مراسلوں اور شاہی فرمانوں کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کی تیاری میں بہترین دماغی قوتیں استعمال ہوتی ہیں۔

لیکن نجی اور ذاتی خطوط صرف دو آدمیوں کا معاملہ ہوتا ہے۔ جب ایک انسان خط کے ذریعے سے کسی دوسرے انسان سے مخاطب ہوتا ہے، تو یہ سمجھتے ہوئے کہ اس کا راز ہمیشہ راز ہی رہے گا، اپنی شخصیت، کردار، خیالات اور نظریات کو واضح طور پر بیان کرتا ہے۔ دنیا کے بیشتر خطوط مکتوب نگار یا مکتوب الیہ میں سے کسی ایک کے یا دونوں کے مرنے کے بعد شائع ہوئے ہیں۔

خط شخصی چیز ہوتی ہے اس میں صرف مکتوب نگار کی ذاتی تصویر ابھرتی ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ خطوط کا دامن بہت وسیع ہوتا ہے، ان میں زندگی کا نچوڑ ہوتا ہے، مصائب و آلام کا تذکرہ ہوتا ہے، ناکامیوں پر اظہار غم اور کامیابیوں پر اظہار مسرت ہوتا ہے، نفرت و

محبت، خلوص وریا کا ذکر ہوتا ہے، اپنے جذبات کی مکمل ترجمانی ہوتی ہے۔ بعض خطوط مکتوب نگار اپنی ذاتی اغراض سے لکھتا ہے۔ بعض سے دوسروں کی اصلاح اور ان کی بھلائی مد نظر ہوتی ہے۔

خطوط میں کبھی مکتوب نگار غصہ میں بھرا ہوا دکھائی دیتا ہے تو کبھی مسکراتا ہوا نظر آتا ہے، بعض خطوط قلم برداشتہ لکھے جاتے ہیں، اور بعض غور وفکر کی منزل سے گزر کر منظر عام پر آتے ہیں۔

مولانا مسعود عالم ندوی کے اگرچہ تمام خطوط دستیاب نہ ہوسکے، لیکن جو ملے وہ اردو ادب میں اپنا ایک مقام رکھتے ہیں۔ ان میں بعض ذاتی اور نجی نوعیت کے خطوط ہیں، اور بعض علمی وادبی نوعیت کے، اکثر خطوط مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی کے نام ہیں، جو نجی اور ذاتی بھی ہیں اور علمی وادبی بھی، لیکن ان میں ہمارے لیے بھی ذوق کی تسکین کا سامان موجود ہے۔

اعلیٰ درجہ کے خطوط کی اہمیت ہی یہ ہے کہ وہ خواہ کتنے ہی نجی اور ذاتی مکتوب کیوں نہ ہوں، ان میں مکتوب نگار کے قلم نے ایسا جادو بھر دیا ہو اور مکتوب میں ایسی دل چسپی پیدا کی ہو کہ مکتوب نگار کی داستان ہر قاری کی داستان بن گئی ہو۔

مولانا کے خطوط کے مطالعے سے جہاں ایک طرف ان کی زندگی کے اکثر واقعات، عقائد و نظریات، سیرت و شخصیت کا پورا علم ہوتا ہے، وہیں اپنے ہم عصروں کے بارے میں ان کی رائے کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے یہ خطوط کافی اہمیت کے حامل ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ خطوط کا ادبی مرتبہ خواہ کچھ بھی ہو، وہ کسی عام انسان کے ہوں یا کسی مشہور فلسفی یا ادیب کے۔ ان میں ادبی چاشنی ہو یا نہ ہو لیکن فن تاریخ نویسی کے لحاظ سے ان کی اہمیت ہمیشہ باقی رہے گی۔ کوئی مورخ جو اس عہد کی تاریخ مرتب کرنا چاہتا ہو، ان خطوط سے صرف نظر نہیں کر سکتا۔ مذکورہ بالا نقطۂ نظر کو سامنے رکھتے ہوئے مولانا مسعود عالم ندوی کے بعض خطوط اکٹھا کیے گئے ہیں۔

کچھ خطوط ایسے ہیں، جن کے صرف بعض اقتباسات مل سکے، اور جن میں تاریخ کا اندراج بھی نہیں مل سکا۔

خدا بخش لائبریری پٹنہ (بہار) میں مسعود عالم ندوی کے ہاتھ کے لکھے ہوئے دو غیر مطبوعہ خط بھی دستیاب ہوئے، یہ دونوں خط پوسٹ کارڈ کی شکل میں ہیں، ان دو خطوط کا عکس بھی دیا جارہا ہے۔

ہر خط کے نیچے ان محرکات کی نشاندہی کر دی گئی ہے، جن سے خط کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہو، اور یہ پتہ چلتا ہے کہ کن حالات میں یہ خط لکھا گیا ہے۔ مکتوب الیہ کے نام کی بھی وضاحت کر دی گئی ہے۔

●●

لہورواخورد، بلتھرا روڈ

(بلیا۔یوپی) ۴رر مضان ن۵۹ھ

محبّ مخلص(۱)

سلام ورحمت

آپ کا محبت نامہ پنجشنبہ کو ملا، جبکہ سفر کے لیے پابہ رکاب تھا، یہاں جمعہ کو پہنچا، حسب دستور سفر کی تھکان سے طبیعت بدمزہ ہو گئی اور جواب میں تاخیر ہوئی۔

لکھنؤ آؤں تو کس امید پر؟ جب گھر بیاباں ہو رہا ہو، تو پھر گھر جا کر کیا ہو، اس وقت دارالعلوم میں کون ہو گا؟ گونڈ پہنچ کر لکھنؤ نہ جانا، صدمہ تو ضرور ہو گا، رائے بریلی تو راستہ سے الگ ہے، اس لیے سردست سوال ہی نہیں اٹھتا۔ انشاءاللہ کسی اور فرصت میں۔

میرا مضمون اور محققانہ، کیا ہی کہی۔ آپ جانتے ہیں کہ "تحقیق" اور "ریسرچ" کے لیے میں نہیں پیدا ہوا تھا، پر روٹی کو کیا کروں، اللہ کوئی سامان کر دے تو اس ریسرچ اور مخطوطات میں آنکھیں پھوڑنے سے باز آجاؤں۔ الفرقان کے لیے آپ کی خواہش اور حکم پر میں نے جو کچھ کر دیا ہے، وہ میرے اصلی رجحان اور خیالات کا آئینہ ہے۔ الندوۃ کے لیے یہ ریسرچ کتاب خانہ کے قیام کا احسان ہیں۔ حکم ہو تو ایسی تحقیق روزانہ کر سکتا ہوں۔ آپ نیاز مندوں کی درخواست اس لیے منظور نہ ہوئی کہ آپ اپنی نیاز مندی کی بناء پر "الفرقان" کے لیے سخت بیگاری لے چکے ہیں۔ دوسری درخواست کی تعمیل بھی اسی "نیاز مندانہ حدود" کے اندر ہونا چاہیے تھی۔

اگر میں جانتا کہ میرے پرانے نیاز مندوں کو مہمل قسم کے ریسرچ میں مزا آنے لگا ہے تو کب کا مضمونچہ حاضر ہو چکا ہوتا، اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اپنے "نیاز مندانہ"

(۱) یہ خط مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے نام ہے، چراغ راہ، مسعود عالم ندوی نمبر ص ۲۰۷

رنگ کا مضمون مختصر نہیں ہو سکتا۔ اور الندوۃ میں لمبے مضمونوں کی گنجائش نہیں۔ بہر کیف کوشش کروں گا کہ ایک تحریر اپنے ذوق کی بھی حاضر کروں، لیکن اگر ذوق اور نیازمندی کی تکمیل میں دقت ہوئی تو کوئی حاضر کر دوں گا۔

ہاں ایک بات رہ جاتی ہے "اصاغر و اکابر" آپ سے کچھ تکلف نہیں ....

....

....اس گروہ میں سمجھ دار صرف دو آدمی ہیں "مفتی اعظم" اور "محمد سجاد" سو یہ لوگ بھی قارئین الندوۃ کی کوئی علمی رہنمائی نہیں کر سکتے۔ مولانا سجاد اس جماعت کے گاندھی اور جناح ہیں۔ جتنا میں ان سے واقف ہوں، شاید ہی کوئی واقف ہو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مطالعہ کتب کے باب میں وہ "الندوۃ" قارئین الندوۃ طالبین ندوہ کی کوئی رہنمائی نہیں کر سکتے۔ اور یہ محمد سجاد وہ شخص ہے، جس کی وسعت نظری، اصابت رائے وغیرہ وغیرہ پر علماء کی جماعت ایمان رکھتی ہے، ہمارے حفظ الرحمٰن اور سعید احمد سے اچھے صاحب نظر ہمارے عبدالسلام اور علی ہیں۔ یہ میری ذاتی رائے ہے، جو روز بروز پختہ ہوتی جاتی ہے، "سخن ہائے گفتنی" لکھ کر بھیج دیجئے، ملاقات تو سر دست نہیں ہو رہی ہے۔ میں یہاں تیرہ تک ہوں، ۱۷ اکتوبر کی صبح کو پٹنہ پہنچوں گا۔

"الفتح" کا وہ نمبر پٹنہ پہنچ کر بھیج دوں گا۔ آپ پڑھ کر خوش ہوں گے۔ اصاغر و اکابر کا سلسلہ ناقص اور نامکمل ہوگا، بہت لمبی بحث ہے۔ بہر حال آپ کی رائے مجھ سے اچھی اور پختہ ہوگی۔ میں نے ضابطہ کا پروٹسٹ کر دیا ممکن ہے اصاغر و اکابر کے بارے میں، میں سلجھا کر نہ لکھ سکوں۔ بہر حال اپنے کو اس سوال کے جواب کا اہل نہیں پاتا، یہ صاف بات ہے گستاخی معاف۔ والسلام

آپ کا

مسعود عالم

بہار شریف

۲/ ذی الحجہ ۵۰ھ

برادر مخلص(۱)

از کی التحیات

محبت نامہ ملا، لیکن وقت پر شافی جواب نہ لکھ سکا۔ کیوں؟ افسوس! کہ عذر لنگ بیان کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ صرف معذرت خواہ ہوں، جذبات کا ہجوم ہے، خیالات کا انبار ہے۔ دل چاہتا ہے کہ دل کھول کر رکھ دوں، درد جگر کا تقاضہ ہے کہ صفحۂ قرطاس کو داغہائے جگر سے لالہ زار بنادوں، کیا لکھوں؟ اپنی تباہی کا مرثیہ، مگر اب یہ بھی بے سود جنت نگاہ کشمیر کی گلگوں پیراہنی کا ذکر کروں (۲) کیا فائدہ کہ اخبارات کے ذریعہ آپ کے دل ودماغ بھی بادہ سے مخمور ہوں گے، کیا اپنی بدنصیبی کا ماتم کروں، شیوخ قوم تو سنت سجاد کی یاد تازہ کر رہے ہیں، عالمان دین کو زنجیریں پہنائی جارہی ہیں، اور ہم تشنہ غفلت سے ایسے سرشار ہیں کہ سروں پر جوں بھی نہیں رینگتی، تمام چیزیں اپنی جگہ پر توجہ کی محتاج اور دل وجگر کو ذوق جگر کاری دے رہی ہیں، لیکن میں یہ نہ شب درشنبہ کی شغل خواری کا ذکر چھیڑوں گا اور نہ صبح سعادت کی کیف آور رنگینیوں سے بحث کروں گا۔ بلکہ اجازت دیجئے تو افسانہ دیرینہ کے متعلق کچھ منتشر وغیر مربوط جملے پیش کردوں۔

جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے، میں اپنے خیالات میں مستقل ہوں، جو کچھ بن پڑتا ہے، اس سے باز نہیں رہتا، معنوی اعتبار سے ایک شاخ قائم کرنے میں بھی کامیاب ہو جاؤں گا، لیکن سوال یہ ہے کہ آپ کن خطوط پر اس کام کو آگے بڑھانا چاہتے ہیں، اگر

---

(۱) مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا نام

(۲) اس زمانہ میں کشمیر کی تحریک چل رہی تھی۔ اور بہت سے مسلمان رہنما وعلماء قید وبند میں تھے۔

پروپیگنڈہ اور دعایت پر اعتماد ہے تو اب تک اس کا بھی کافی سامان نہیں، افراد کا پیدا کرنا تو مشکل کام ہے، جب تک تربیت گاہ کا انتظام نہیں ہوتا، یہ کام صحیح طور پر نہیں ہو سکتا۔

اس وقت اصل میں ہم خیال حضرات کی تنظیم اور ان میں کام کی صلاحیت پیدا کرنا ہے، مختلف جگہوں میں جمعیت نوجوانان اسلام کی بناڈالنی چاہیئے، جس کا ظاہری مقصد تبادلہ افکار، زبان وادب کی ترقی اور مطالعہ جرائد واخبارات ہو۔ یہ تمام باتیں ابتدائے کار سے پیش نظر ہیں۔

امید ہے کہ آپ تمام امور پر غور فرما کر جواب سے مطلع فرمائیں گے۔(۱)

---

(۱) پرانے چراغ ص: ۳۱۹

۱۶ / ۱۲ / ۷۲ھ

محبّ گرامی! (۱)

سلام و تحیت فراواں

آپ کے عنایت نامے رہائی کے بعد نظر سے گزرے، محبت واخلاص کے نقوش اور گہرے ہوگئے، اللہ تعالیٰ آپ کو خدمت دین کے زیادہ سے زیادہ مواقع عطا کرے۔ مجھ فقیر کے لیے یہ بس ہے کہ ایک پاکباز نوجوان سیّد کے دامن الفت سے وابستہ ہے۔

دوسرا خط بھی مل گیا، شکریہ پر شکریہ! کیا گرفتاری کیا رہائی؟ سیرت نگاری کرتا رہا، مولوی جعفر تھانیسری اور مولانا یحییٰ علی کی مشقتوں کے مقابلے میں یہ میٹھی اور بی کلاس کی آزمائشیں کس شمار میں ہیں؟ حاشا! کہ ابتلاء کو دعوت نہیں دیتا اور نہ اس مریض ناتواں میں برداشت کی طاقت ہے، پر یہ مہمانی بچی نہیں، بس سیاسی زبان میں زیارت (یاترا) ہوگئی، جھجک تو الحمد للہ کبھی نہیں تھی، اور کچھ چھپی چھپائی ہوگی تو وہ بھی دور ہوگئی۔

---

(۱) مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی کے نام۔ اس خط کے بارے میں مکتوب الیہ لکھتے ہیں:

"تحریک ختم نبوت کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے ان کو بھی نوازا، اور اس زار و نزار مریض کو جس کو ہمیشہ راحت واحتیاط کی ضرورت رہتی تھی، راولپنڈی جیل میں اسیری اور نظر بندی کے دن گزارنے پڑے، مسعود صاحب کی اس سعادت پر بڑا رشک آیا، ان کے علمی فضائل وکمالات کا اعتراف ہمیشہ سے تھا، لیکن اس موقع پر دل نے ان کی سبقت وفضیلت اور اپنی پسماندگی کا صاف اعتراف کیا، اسی زمانے میں میں نے عزیزی محمد عاصم سلمہ کو ایک خط لکھا، جس میں ان سے یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ مولانا تک میری مبارک باد پہنچادیں............. چار مہینے کی اسیری کے بعد ۱۲/ اگست ۱۹۵۳ء کو جب وہ رہا ہوئے تو میں نے مسرت و تہنیت کا خط لکھا، اس کا انہوں نے جو جواب دیا وہ ان کے صحیفۂ اعمال میں انشاء اللہ ہمیشہ درخشاں رہے گا، اور کیا عجب ہے کہ وہ میزان قیامت میں بھی وزنی ثابت ہو۔

اس تنہائی میں کچھ حدیث پڑھ لی، اللہ کرے یہ سلسلہ جاری رہے، کل لاہور جا رہا ہوں پھر کبھی اطمینان سے۔(۱)

والسلام

عاجز مسعود (۱۶/ ۱۲/ ۲۷ھ)

(۱) پرانے چراغ ص ۳۵۴

اورینٹل پبلک لائبریری

بانکی پور، پٹنہ

مسعود نواز(۱)

سلام شوق

نباہ کا شبہ اور مسعود بے نوا سے! اللہ جھوٹ نہ بلوائے، یہ گنہگار ''نباہ'' اور تعلقات کی استواری میں خام ثابت نہیں ہو گا۔

دارالعلوم کے زمانۂ قیام میں برادران یوسف اور گھناؤنی سیاست کے علمبرداروں کے باعث ممکن ہے مجھ سے کبھی بداخلاقی یا بے عنوانی ہو گئی ہو، ورنہ اس بیچ میرا دامن کم ازکم آداب ''نفاق وریا'' کی آلودگیوں سے پاک ہے، والعلم عند اللہ، وھو اصدق الشاھدین۔

شبلی صاحب کو نہ لکھا، اچھا کیا، وہ شعبان ہی میں انکار کر چکے تھے، صرف میرے اصرار کے باعث انہوں نے حامی بھری تھی، حیدر آبادی بھائی کے وعدوں پر جی رہے ہیں، اللہ مبارک کرے، اور ہر رنگ میں کامیاب اور بامراد بنائے، حافظ وظیفہ تو دعا گفتہ است و بس۔''

.... م صاحب بہت مسرور ہوں گے، یہاں بعض جگہوں کے لیے درخواست دے گئے ہیں، میں نے انہیں ازخود اطلاع کر دی تھی، کہ میرے چلے آنے کے بعد ان کا تقرر لازمی ہے، باہر کا آدمی لائق کم معاوضہ نہیں آسکتا۔ اس لیے ...... کے سوا کوئی ہماری جماعت میں نہیں۔ جسے آپ لے سکیں، اچھے اچھے علماء اور حاملین اقلام کی عبارت خوانی

---

(۱) مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی کے نام

تک قابل مضحکہ ہے، نام کیا لوں؟ آج کل بھی ایسی مثالیں سامنے ہیں، پھر زعم ہمہ دانی پر اور ہنسی آتی ہے، میرے لیے راحت اور سکون کے اسباب ضرور فراہم ہیں، اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں، ندوہ کی ناپاک اور خسیس ترین عداوتوں سے دوچار رہنے کے بعد، خوبصورت الماریوں اور بے زبان سنہری جلدوں کی صحبت بس غیر مترقبہ معلوم ہوتی ہے۔

ندوہ کی محبت یہاں آنے سے کم نہیں ہوئی، بلکہ اور بڑھ گئی، آؤں گا، دو چار روز رہوں گا اور ان دنوں میں، کسی درجہ میں پڑھاؤں گا بھی، لیکن ملازم ہو کر صرف مجبوری اور پریشانی کی حالت میں آسکوں گا۔

ایک رونا ضرور ہے وہ ندوہ کی تباہی کا۔ اللہ نے مجھے داروغۂ مطلق تو بنایا نہیں، اس خیال سے خاموش ہوں، اور خاموش رہتا ہوں، بہر حال چار ماہ کی رخصت تو منظور ہو ہی چکی ہے، اسی اثناء میں کوئی فیصلہ کروں گا۔ اغلب یہ ہے کہ مستعفی ہو جاؤں گا۔ یوں مستقبل کا حال اللہ کو معلوم ہے، ممکن ہے مرضی مولیٰ میرے گناہوں کی پاداش میں دو چار ماہ کی سزا اور دے دے۔ علی میاں، جس ماحول میں نفس انسانی اور اغراض کی پرستش ہوتی ہے، وہاں ایک خوددار سکون سے نہیں رہ سکتا۔

داستان طویل ہے، پھر کبھی۔ میں ندوہ کی رام کہانی سننے کا مشتاق ہوں بلکہ دل ادھر ہی لگا رہتا ہے، ابھی میری ڈاک لائبریری ہی کے پتے سے آتی ہے، اس لیے کارڈ میں کوئی قابل اخفا بات لکھنا ہو تو عربی میں لکھیے ورنہ لفاف۔ (۱)

تفصیل سے سننے کا منتظر

مسعود بے نوا

---

(۱) چراغ راہ، مسعود عالم ندوی نمبر ص ۲۰۹

سیدی و مخدومی(۱)

ادم اللہ ظلکم علی رؤوس المسلمین

۱۳؍ مارچ کو لکھنؤ پہنچا، حالات تکلیف دہ محسوس ہوئے، چار روز رہا، اور ہر ہر فرد سے ملنے کی کوشش کی اور مایوس واپس ہوا۔

سب سے پہلی بات یہ کہ حافظ عمران خاں صاحب سے کوئی مدرس یا طالب علم خوش نہیں، ولا استثنیٰ منھم احداً سواء من اسر القول او جھر بہ، بس فرق یہی ہے کہ کوئی کہتا ہے اور کوئی صبر کرتا ہے، علی میاں، محمد ناظم صاحب اور عبد السلام صاحب کی طرح ان کا علمی رعب بھی نہیں، موجودہ خلفشار کی ایک بڑی اور اہم وجہ یہ بھی ہے، اس ضمن میں بعض جزئی باتیں بھی آ گئیں۔ طلبہ اور بعض مدرسین یہ کہتے تھے کہ ندوہ کو اس کے مقاصد سے ہٹایا جا رہا ہے۔ جرح پر بعض مثالیں دیں:

---

(۱) علامہ سیّد سلیمان ندوی کے نام!

سید صاحب علیہ الرحمۃ کے نام مسعود صاحب کا صرف یہی ایک خط دستیاب ہوا، اس خط کا پس منظر مسعود صاحب "مکاتیب سلیمان" کے حاشیہ میں یوں بیان کرتے ہیں:

دار العلوم ندوۃ العلماء میں ایک بڑی خطرناک اسٹرائک ہوئی۔ مارچ ۴۳ء کی ابتدائی تاریخوں میں (جبکہ راقم اپنے مقالہ "شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک پر ایک نظر" کی آخری قسط ختم کر رہا تھا) طلبہ ندوہ کا تار ملا جلد آؤ۔ راقم انجمن طلبائے قدیم ندوہ کے نمائندے کی حیثیت سے ندوہ کی مجلس انتظامی کا رکن تھا۔ اس لیے تار کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ دوسری طرف حضرت الاستاذ کی آزردگی کا بھی خوف لاحق تھا۔ اس وقت دار العلوم کے نظم و نسق کی ذمہ داری یکسر ان ہی کے کندھوں پر تھی۔ زیر نظر کارڈ کا جواب اس طرح ملا کہ جا بجا اس کے بین السطور میں مختصر کلمات بڑھا دیے گئے اور کارڈ واپس کر دیا گیا۔ اس کے بعد کے مکاتیب سے صورت واضح ہو گئی۔ تبرک اور تاریخ کے لیے یہ خط ان ہی کلمات کے ساتھ درج ہے۔ راقم نے اپنے خط کی نقل کبھی نہیں رکھی۔ یہ مکتوب کلمات سیّد کے طفیل محفوظ رہ گیا۔

(۱) انگریزی کو لازمی سے اختیاری کرنے کی کوشش۔

(۲) الاصلاح پر ضرورت سے زیادہ پابندی

(۳) اس کا چندہ دفتر سے وصول نہیں کیا جاتا۔

(۴) عربی جلسہ ملتوی کر دیا گیا۔

(۵) منطق کے اضافے کی کوشش۔

(۶) کھیل کے بند کرنے کا خیال۔

(۷) دار الطعام کو طلبہ کے ہاتھ سے نکال لینا وغیرہ وغیرہ۔

اور غیر مستطیع طلباء کے ساتھ عدم اخفا کی شکایت تو عرصے سے ہے اور میں خود دیکھ چکا ہوں۔

عمران خاں صاحب نے بعض چیزوں کا اعتراف کیا اور بعض کی تردید، جن چیزوں کا اعتراف کیا، ان کی نسبت اپنے افسروں کی طرفداری کی جیسے انگریزی کو اختیاری کرنے کا خیال۔

میں نے سرسری طور پر یہ چند باتیں عرض کیں۔ مطلب یہ ہے کہ مکمل تحقیق اور OVER HAULING کی ضرورت ہے۔ اسٹاف دن بدن گرتا جارہا ہے، جو اہل علم ہیں وہ بددل ہیں۔

علی میاں بھی ان ہی حالات سے تنگ آکر الگ ہوئے ہیں اور الگ رہنا چاہتے ہیں گو ابھی ایک سال کی چھٹی لی ہے، عمران خاں صاحب کی نااہلیت پر ان کا بھی اتفاق ہے۔ ایک عالم کے بجائے ان کا برتاؤ پولیس افسر کا ہے۔

گو یہ ہنگامہ غلط طور پر شروع ہوا ہے اور آتشزدگی کی حرکت انتہائی شرمناک تھی، لیکن درمیان میں اصولی اور اہم باتیں آگئی ہیں۔ جن پر جناب کی توجہ فرمائی کی ضرورت ہے۔ عاجز اعظم گڈھ آکر تفصیلات عرض کرنا چاہتا تھا کہ کاشغری (۱) صاحب کا تار ملا جس میں

---

(۱) عبدالرحمٰن کاشغری ندوی

انھوں نے ہمارے ڈاکٹر کی بنارس میں موجودگی کی اطلاع دی تھی، رخصت ختم ہو رہی تھی میں سیدھا بنارس پہنچا، مولوی عبدالحمید صاحب کے توسط سے آسانی ہو گئی اور ڈاکٹر سے مل کر پرسوں رات واپس آیا ہوں۔ خادم طالب قدیم اور نمائندہ طلبائے قدیم کی حیثیت سے گیا تھا۔ لیکن نظامت اور اہتمام دونوں نے انتہائی سرد مہری برتی اگر واقعی یہ لوگ چاہتے ہیں کہ ہم لوگ دارالعلوم سے بے تعلق ہو جائیں تو ایک بار صاف طور سے کہہ دینا چاہیے۔ ہم اتنی دور رہ کر کیوں دردسر مول لیں اور دن رات نام رٹا کریں، ایک سال سے رکن ہوں لیکن کسی قسم کی چھوٹی بڑی اطلاع بھی نہیں ملی۔ واہ رے ادارہ اور واہ رے رکنیت۔

چونکہ ہر موقع پر جناب کا نام لیا جاتا ہے اس لیے ہم لوگ خاموش ہو جاتے ہیں۔(۱)

والسلام

خادم۔ مسعود عالم ندوی

---

(۱) مکاتیب سلیمان ص

کراچی

جمعہ ۳/مارچ ۱۹۵۴ء

برادرم (۱)

سلام مسنون

توقع ہے کہ اب تم بخیر و عافیت واپس آگئے ہو گے۔ میرا سفر تو اچھی طرح کٹا۔ مگر یہاں کی آب و ہوا آج کل بہت خراب ہے۔ وہ دسمبر کی بات نہیں رہی۔ تمہیدی کام تو غالباً آسانی سے اور جلدی ہو جائے گا۔

ہفتہ عشرہ میں پتہ چلے گا، ۱۵/ سے شوریٰ ہے اور شاید ۲۰۔۲۱/ تک جائے۔ اسی میں فیصلہ ہو گا۔ اگر فیصلہ فوری طور پر "عدم سفر" کے حق میں ہوا۔ تب تو فوراً واپس آجاؤں گا۔ البتہ اگر سفر کے حق میں ہوا، جیسا کہ رجحان ہے تو پھر اب تک کچھ طے نہیں کر سکا ہوں۔ افضل صاحب کا ایک مہینہ یہاں انتظار کروں یا بہاولپور یا پنڈی ہی چلا آؤں۔ ہر شکل میں کچھ نہ کچھ پریشانی ہے۔ یہاں سب سے بڑی تکلیف آب و ہوا کی ہے۔ بہر حال آئندہ جمعہ تک پھر لکھوں گا۔

تم اپنی مفصل روداد لکھو، خاص کر یہ بتاؤ کہ کیا کیا لا سکے ہو۔ تاکہ سفر کی صورت میں جو کمی ہو اس کے پورا کرنے کی کوشش کی جائے۔ پوری فہرست مع حساب کے بھیج دو تو اچھا ہو۔ دمشق سے جواب آگیا ہے جواب کل ابوالخیر عرتسوسی کی معرفت بھیج رہا ہوں۔ وہ کل جا رہے ہیں اب تم عام طور پر جواب لکھ کر ہفتہ وار ڈاک پر بھیج دیا کرو۔ پیر کا دن مقرر کر لو میں جمعہ کے دن لکھا کروں گا۔ (۲)

والسلام

عاجز مسعود عالم ندوی

---

(۱) مولانا کے خاص رفیق اور شاگرد محمد عاصم الحداد کے نام

(۲) چراغ راہ، مسعود عالم ندوی نمبر ص ۲۰۹

سنٹرل جیل راولپنڈی

۲۹؍رمضان ۲۷ھ

عزیز مکرم(۱)!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا عنایت نامہ عرصہ ہوا ملا تھا، مگر جواب کا موقع نہ مل سکا۔ ہفتے میں صرف دو خط کی اجازت ہے اس لیے تمام دوستوں عزیزوں کو وقت پر جواب دینا مشکل ہے۔ امید کہ آپ میری مجبوریوں کے پیش نظر خیال نہیں کریں گے۔

اور حالات اچھے ہیں۔ صحت میری بہت غنیمت ہے۔ روزے باہر بھی نہیں رکھ سکتا تھا یہاں رکھنے کا اور بھی امکان نہیں تھا(۲) تراویح پوری بیس رکعتیں دو ختم پڑھے اور حدیث کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ اس اتفاقی موقع سے فائدہ نہ اٹھانا بڑی ناشکری ہوگی۔ مطالعے کی رفتار اچھی ہے، جانے کب تک یہاں رہنا ہے۔ بہر حال دو چار مہینوں میں بھی خاصا پڑھ لوں گا اور انشاء اللہ یہ مطالعہ ہمارے کام میں بہت مد ہوگا۔ اب تک میں نے حدیث کا باضابطہ اور مسلسل مطالعہ بہت کم کیا ہے، باہر اتنی فرصت کہاں ملتی ہے؟ اور بھی اس تنہائی سے فائدے پہنچ رہے ہیں۔ بہت سی عادتیں چھوٹ رہی ہیں۔ آپ کو سن کر حیرت ہوگی کہ میں روزانہ اسٹوپ پر چائے بناتا ہوں، برتن دھوتا ہوں بلکہ مانجھتا ہوں۔ بار بار لوٹوں میں پانی لاتا ہوں۔ جو کام آپ سے نہیں ہوتے وہ بھی اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے بخوبی پورے ہو جاتے ہیں۔ گجرات کے اسیروں میں دو چار نوجوان واقف اور متفق نکلے۔ انہوں نے

---

(۱) محمد نصر اللہ خاں صاحب کے نام!

(۲) تحریک ختم نبوت کے سلسلے میں جماعت کے دوسرے زعماء کے ساتھ مولانا بھی ان دنوں پابند سلاسل تھے۔

نہانے کے لیے پانی گرم کرنے اور تیل مالش میں بڑی مدد کی اور کر رہے ہیں۔ غالباً آج کل میں وہ لوگ رہا ہو جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ پھر کوئی نظم کر دے گا۔

کل سے رہائیاں ہو رہی ہیں مگر خیال ہے کہ ہم لوگ ابھی کچھ دنوں اور مہمان رہیں گے، بہر حال "بادہ" تو ظرف دیکھ کر ہی لیتے ہیں الحمد للہ کہ اپنی بیماری اور کمزوری جسم و جان کے باوجود دل بالکل مطمئن اور قانع ہے۔

مومن ابتلاء کو دعوت نہیں دیتا۔ مگر جب آجائے، تو اللہ تعالیٰ سے استقامت کی دعا مانگتا ہے، ہمارا ابھی یہی حال ہے، الحمد للہ ہم یہاں کچھ شوق سے نہیں آئے مگر جب ہمارے کرم فرما ہمیں لے آئے ہیں تو توکلا علی اللہ ہم خوش اور مطمئن ہیں، اور ہر طرح خیریت ہے۔ غازی صاحب اچھے ہیں تمام دوستوں اور رفیقوں خاص کر ہمارے میزبان (۱) کو بہت بہت سلام۔ آپ میرے خط کا انتظار کیے بغیر لکھتے رہیں۔ (۲)

والسلام

عاجز مسعود عالم ندوی

۱۲/٦/۵۳ء

---

(۱) حافظ مولانا عبدالواحد صاحب رکن جماعت اسلامی گوجرانوالہ

(۲) چراغ راہ، مسعود عالم ندوی نمبر ص ۲۰۸

دار العروبة للدعوة الاسلامية

راولپنڈی

۲۰/۳/۳/۷۳ھ

برادر عزیز(۱)

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا خط چند دن ہوئے ملا، پچھلے دنوں طبیعت خراب رہی۔ اس لیے اب تک جواب نہ دے سکا۔ خیال تھا کہ خود جواب دوں مگر اب تک کمزوری کافی باقی ہے۔ اس لیے خود لکھنے کی ہمت نہ کر سکا۔ مجبوراً محمد عاصم سے لکھوا رہا ہوں۔ والد صاحب کو دیکھنے کے لیے ہر آن تڑپتا ہوں۔ آپ نے اپنے خط میں جو باتیں لکھی ہیں، مجھے خود ان کا ازحد احساس ہے۔ مگر ان چھ سالوں میں ایک مرتبہ بھی ادھر آنے کی اجازت نہیں ملی۔ پر کوشش ہمیشہ رہی اور اب تک جاری ہے۔ پاسپورٹ کی درخواست ۱۲/ اکتوبر ۵۲ء کو دی تھی۔ جواب تک نہ منظور ہوئی ہے اور نہ روکی جاتی ہے۔ اپنی حد تک بڑی دوڑ دھوپ کی۔ بہر حال اب مزید دوڑ دھوپ کی جائے گی۔ دعا فرمائیں اللہ تعالیٰ کامیابی عطا فرمائے، والد ماجد کو آپ لوگ تسلی

---

(۱) محمد حسنین سیّد (دربھنگہ بہار) کے نام:

اس خط کا پس منظر مکتوب الیہ یوں بیان کرتے ہیں:

میرا ذہن فوراً مولانا مسعود عالم مرحوم کے ضعیف والد بزرگوار مولانا حکیم عبدالشکور مدرس مدرسہ اسلامیہ بہار شریف ضلع پٹنہ کی طرف گیا، آہ! ان پر اس خبر (انتقال) کا کیا اثر ہوگا۔ چند ماہ ہوئے جب میں بہار شریف گیا تو ان کی زیارت کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ یہ ملاقات کئی سال کے بعد ہوئی تھی، اول ضعف بصارت کی وجہ سے مجھ کو پہچان نہ سکے، جب مولانا مسعود صاحب مرحوم کے حوالے سے اپنا تعارف کرایا...... تو جوش اور شفقت کے جذبہ میں اٹھ کر بیٹھ گئے۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

دیتے رہا کریں۔ کبھی کبھی دورے میں ادھر نکل جایا کریں تو اچھا ہے۔ پچھلے تین ہفتے طبیعت کافی خراب رہی۔ اب اچھی ہے لیکن کمزوری باقی ہے دعاؤں میں فراموش نہ کریں۔

دوسرے رفیقوں اور عزیزوں سے بھی یہی درخواست ہے۔ آپ لوگوں سے ملنے کو طبیعت بہت چاہتی ہے۔ لیکن جس خوف سے آپ خط نہیں لکھتے، اسی اندیشے سے میں بھی خط لکھنے سے احتراز کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ دلوں کا حال خوب جانتا ہے۔

تمام رفقاء اور احباب سے سلام کہئے، غازی صاحب اچھے ہیں، سلام کہتے ہیں، محمد عاصم بھی سلام عرض کرتا ہے۔(۱)

مسعود عالم ندوی

بقلم محمد عاصم

(آئندہ کا بقیہ) میری خیریت دریافت کی، پھر آبدیدہ ہو کر فرمانے لگے کہ اب میری عمر اسّی سال سے تجاوز کر چکی ہے۔ طاقت و بصارت جواب دے رہی ہے دنیا کے ہر کام سے فارغ ہو چکا ہوں، قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہوں۔ اب بس ایک ہی تمنا اور آرزو ہے کہ مسعود کو ایک نظر دیکھ لیتا تو مرتا۔ پھر بتایا کہ مسعود کے خطوط برابر آتے رہتے ہیں وہ خود بھی یہاں آنے اور مجھ سے ملنے کے لیے بے قرار ہیں۔ اور کئی سال سے ہندوستان آنے کے لیے پاسپورٹ حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں.......... ....

...... ان کی گفتگو اور حالات سے متاثر ہو کر احتیاط کے باوجود میں نے مولانا کو خط لکھا، تقسیم کے بعد چھ سال میں مولانا مسعود عالم کو میں نے یہ پہلا خط لکھا ان کو ان کے والد ماجد کے حال سے مطلع کیا اور مشورہ دیا کہ جلد آنے کی کوشش کریں، ورنہ ان کی ضعیفی اور ضعف کی وجہ سے اندیشہ ہے کہ تاخیر سے ملاقات نہ ہو سکے۔ اس کے جواب میں: مذکورہ بالا خط مولانا مسعود عالم مرحوم نے لکھا۔

(۱) چراغ راہ، مسعود عالم ندوی نمبر ص ۷۵

خطوط کے اہم اقتباسات

اس موضوع کے تحت مولانا مسعود عالم ندوی کے کچھ خطوط کے اہم اقتباسات پیش کیے جا رہے ہیں، دراصل مکتوب الیہ نے اپنے مضمون میں موضوع کی مناسبت سے اسی اقتباس کو نقل کیا ہے، جس سے کسی خاص مسئلہ پر روشنی پڑتی ہو۔

ہم یہاں ان ہی اقتباسات کو خط کے پس منظر کے ساتھ نقل کرتے ہیں۔

مولانا سیّد ابو الحسن علی ندوی کے نام ایک خط کا اقتباس!

نرسوں یا چوتھے روز محبت نامہ ملا، پڑھ کر سکتہ سا ہو گیا، یہ چار دن اور راتیں بلا مبالغہ آپ کی یاد اور پچھلی فراموش شدہ (جو الحمد للہ کہ مسعود بے نوا نے کبھی فراموش نہیں کی) صحبت کے خیالی تذکروں میں گزری ہیں "تزویر کلام" جس کا عمر فاروقؓ سقیفہ والی روایت میں ذکر کرتے ہیں، مجھ پر مسلط ہے، باتیں بناتا رہا، انشاء پردازی کا زور دکھلاتا رہا، دل ہی دل میں لمبے لمبے خط لکھ ڈالے، دماغ کے لوح و قلم پر جانے کتنی صفائی پیش کر ڈالی، یا یوں سمجھئے کہ ان چار دنوں میں صرف یہی خیال مسلط رہا کہ کسی طرح علی میاں کے دل و دماغ سے یہ اثر دور ہو جائے: ندوہ سے علیحدگی، فکر و مسلک میں تھوڑا سا تفاوت، بعض مسائل میں اختلاف اور زندگی کی راہوں کے بدل جانے کے باوجود دو شخصیتوں سے میری محبت کم نہ ہوئی۔

پٹنہ، جالندھر، راولپنڈی اور بغداد ہر جگہ ان کے ذکر سے مجلس معطر رہی، اس حد تک کہ میرے رفیق، عزیز اور شاگرد سب کے سب انہیں اپنا استاد، مربی اور اپنے سے قریب سمجھتے ہیں۔ جماعت اسلامی اور دوسرے حلقوں کی چھوٹی بڑی مجلسوں میں جب کبھی ذکر آیا تو اسی محبت و اظہار قربت کے ساتھ اور اس جرات و صفائی کے ساتھ کہ تحزب کی ماری ہوئی مخلوق کو بارہا حیرت ہو ہو گئی، آپ سمجھے یہ دو بزرگ کون ہیں؟ آپ جیسے ذہین آدمی سے صاف صاف کیا بیان کروں، مگر وقت آ گیا ہے کہ صاف صاف کہدوں۔ یہ دونوں دودمان شجرۂ نبوت، صورت و سیرت میں سادات کرام کے سچے نمونے، ایک استاذ، دوسرا دوست و محبوب، محبوب تو استاد بھی ہیں، پر انہیں "محبوب" کہتے ہوئے ادب مانع ہے۔ سیّد صاحب قبلہ کی محبت کبھی کم نہیں ہوئی، اللہ گواہ ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سیّد صاحب بھی اس کسک کو محسوس کرتے ہیں، بارہا ناظم صاحب سے کہہ بھی گئے ہیں۔ "مسعود عالم باغی ہے، مگر "وفادار" اس نالائق کے لیے یہ شہادت کافی ہے، جانے علی میاں بھی یہ کسک محسوس کرتے ہیں یا نہیں؟ کہتے ہیں "دل را بہ دل رہست" ....

....

.... ”امابعد! آخر ماجرا کیا ہے؟ تنقید و تحسین میں آخر برا ماننے کی بات کیا ہے، جہاں تک فکر ورائے کا تعلق ہے، دوستوں کے درمیان اختلاف قابل برداشت ہونا چاہیے۔“(۱)

---

(۱) پرانے چراغ ص ۳۵۱

مکتوب الیہ کے بعض رسائل پر ”ترجمان القرآن“ میں مسعود صاحب نے کچھ ایسا تبصرہ کیا، جو مکتوب الیہ کی توقع کے برخلاف تھا، اور کچھ گرفتیں ایسی تھیں جو غلط فہمی پیدا کر سکتی تھیں۔ مکتوب الیہ نے اپنے ان خیالات کا اظہار بے تکلف ہو کر ایک خط میں کر دیا۔ اسی خط کا یہ جواب ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں،(۱)

یہ لوگ مجھ سے انٹرویو چاہتے تھے۔بیٹا باپ کے متعلق کیا انٹرویو دے۔

آپ کو استاذ مرحوم .... آہ کہ مرحوم لکھتے ہوئے قلم کا جگر شق ہوا جاتا ہے............ سے جو تعلق تھا،اس کی بنا پر تعزیت کا یہ خط لکھ رہا ہوں۔ اگرچہ تعزیت کا مستحق میں خود ہوں۔(۲)

---

(۱)علامہ سیّد سلیمان ندوی علیہ الرحمۃ کی وفات پر یہ خط مسعود صاحب نے لکھا تھا،محبت و عقیدت ایک ایک سطر سے جھلکتی دکھائی دے رہی ہے،سیّد صاحب سے مسعود صاحب کا رشتہ صرف استاذ شاگرد کا نہ تھا،بلکہ سیّد صاحب ہی ان کے سب کچھ تھے محسن و مربی بھی اور معلم و استاد بھی۔

(۲)چراغ راہ،مسعود عالم ندوی نمبر ص ۱۱۲

مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی کے نام(۱)

پرسوں صبح کو حسب معمول قرآن مجید کی تلاوت کر رہا تھا، اس آیت پر آکر رک گیا، بار بار پڑھتا رہا مگر تسکین نہ ہوئی۔

ام حسبتم ان تدخلوا الجنة ولما یاتکم مثل الذین خلوا من قبلکم مستھم الباسآء و الضرآء وزلزلوا حتیٰ یقول الرسول والذین آمنوا معه متیٰ نصر الله الا ان نصر الله قریب

اور پھر اس ایک آیت کے بعد کتب علیکم القتال و ھو کرہ لکم پر نظر گئی تو یقین آگیا۔

ایک اور لطیفہ ملاحظہ ہو، شوقی کا ایک شعر ہے (دمشق کی تباہی ۲۶ء کے مرثیہ کا شعر ہے) وہ مرثیہ جس کا مطلع ہے۔

سلام من صبا بردی ارق
و دمع لایکفکف یا دمشق

ہاں تو شعر ہے۔

ومن یسقیٰ و یشرب بالمنایا
اذ" الاحرار" لم یسقوا و یسقوا

کیا فرماتے ہیں اذا لاحرار لم یسقوا ویسقوا کے بارے ہیں؟ کہاں ساقی گری جام شہادت کی اور کہاں الاستعمار الاروبی کی طرف یدالمعونة بڑھانا، تف ہے۔ یہ شذرات ہیں اور مرآت افکار بھی، دماغ اچٹا ہوا ہے، اور دل اجڑا ہوا، امیر شکیب نے کہیں لکھا ہے "لایجتمع الاسلام والمیل الی الاستعمار الاروبی فی قلب واحد" مگر یہ کیا اندھیر ہے کہ صادق پور کے ہمسائے اور ہم وطن اسی استعمارِ اُوربی کو اپنا ملجاؤ ماویٰ سمجھنے لگے

---

(۱) یہ خط ۴۲/۸/۲۵ء، مطابق ۶۱/۸/۱۲ھ کو لکھا گیا ہے۔

ہیں۔ گزشتہ تین ہفتوں میں یہ عجیب PHENOMENON "مصری ظاہرہ" نگاہوں کے سامنے آیا، میرا ذاتی خیال یہ نہیں تھا کہ سلطان شہید کی برادری اس قدر "جعفریت" اور "صادقیت" (۱) میں ڈوب گئی ہے، پچھلے سالوں میں راقم پاکستانیوں سے کچھ حسن ظن رکھنے لگا تھا، لیکن اس گھناؤنے (۲) مظاہرے کے بعد تو ان پیدائشی مسلمانوں سے ہر قسم کی امید اٹھ گئی۔ (۳)

---

(۱) جعفر از بنگال و صادق از دکن

(۲) ۴۲ء کے ہنگامہ میں مسلمانوں نے جو بے حسی کا مظاہرہ کیا، اور اپنے ہم وطنوں کی مصیبتوں پر کوئی صدائے احتجاج بلند نہ کی، بلکہ اس کے برخلاف مسرت کا اظہار کیا، اس کی طرف اشارہ ہے۔

(۳) چراغ راہ، مسعود عالم ندوی نمبر ص ۵۳

محمد ناظم سباق کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں۔(۱)

مرادفات کا آپ نے کثرت سے استعمال کیا ہے۔ تین تین چار تک آپ مترادف جملے لیتے آئے ہیں۔ میں نے اس میں کمی کر دی ہے، بعض لوگ اسے پسند کرتے ہیں، لیکن جو طریقہ ماثوراً مولانا شبلی سے ہم تک پہنچا ہے وہ اس کے برخلاف ہے۔ مولانا شبلی اپنے شاگردوں سے فرمایا کرتے تھے کہ تحریر میں جتنے ایسے جملے نظر آئیں جن کے نکالنے سے مطلب خبط نہ ہوا نہیں حذف کر دو، پختہ مشق لکھنے والوں کی یہی شان ہوتی ہے کہ وہ مختصر اور جامع لکھتے ہیں (۲).................

---

(۱) مولانا مسعود عالم ندوی علامہ شبلی اور سیّد سلیمان ندوی کے جانشین تھے، اور ایجاز واختصار ان حضرات کی تحریروں کا طرہ امتیاز تھا۔ علامہ شبلی کے قلم سے ایک جملہ بلکہ ایک لفظ زائد از ضرورت نہیں ہوتا ہے۔ اسی طرح سیّد سلیمان ندوی بھی ایجاز واختصار پر زور دیتے تھے، اور مسعود صاحب بھی جو کچھ لکھتے وہ "ما قل ودل" کا نمونہ ہوتا تھا۔ اسی اصول کی طرف مذکورہ خط میں مکتوب الیہ توجہ دلاتے ہیں۔

(۲) چراغ راہ، مسعود عالم ندوی نمبر ص ۱۷۹

مولانا سیّد ابوالحسن ندوی کو ایک خط میں لکھتے ہیں (۱)

میں یہاں آیا حالات سے مجبور ہو کر، لیکن معلوم ہوا کہ عربی ختم ہو جائے گی دو ہی ہفتوں کے بعد ارادہ متزلزل ہو گیا، اتنے میں "فاران" بند ہونے لگا، شیر محمد (۲) صاحب کو ایک جگہ مطلوب تھی۔ سیّد صاحب مدظلہ کا گرامی نامہ آیا کہ ندوہ چلے آؤ، کوئی صورت نکالی جائے گی۔

اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ، فوراً تیار ہو گیا، شیر محمد صاحب بھی خوش ہوئے مالک اخبار کو کچھ رنج ہوا، ڈاکٹر صاحب مدمجدہ نے بھی اپنی عنایت سے مسرت کا اظہار کیا ہے، اب اس ناچیز کو اور کیا چاہیے۔ میرے پاس اس دوران میں متعدد خطوط آئے "مدینہ" ہر جگہ جاتا ہے، تمام ملنے والوں نے اپنی بری بھلی رائے دی لیکن اب تک اس کا خط نہیں آیا تھا جس کی محبت میرے دل میں جاگزیں ہے، محبت نہیں بلکہ احترام۔ (۳)

سچ کہتا ہوں کچھ تکلیف محسوس کر رہا تھا معلوم نہ تھا کہ آپ کہاں ہیں ورنہ خود لکھتا۔ آخر آج صبح نوید بشارت ملی اور دل کا ایک بوجھ دور ہو گیا۔ میں اس کا تصور نہیں کر سکتا تھا کہ آپ دارالعلوم سے الگ ہوں، اور نہ اپنے لیے پہلے تصور کر سکتا تھا، لیکن حالات سے مجبور ہو گیا۔ پھر کشش لے جا رہی ہے۔ سیّد صاحب کا فرمان ایک بہانہ بن گیا ہے آپ سے دل کی بات کہہ دی ورنہ لوگوں کو یہی لکھا ہے کہ سیّد صاحب کی حسب ہدایت جانا پڑ رہا ہے۔ (۴)

---

(۱) ۱۹۳۷ء میں مسعود صاحب ندوۃ العلماء کے قیام سے کچھ غیر مطمئن ہو گئے، اور اخبار "مدینہ" بجنور میں بحیثیت ایڈیٹر کے چلے گئے۔ لیکن ندوۃ العلماء کی جدائی خود ان پر شاق تھی، اور ندوہ کی یاد ہر وقت ستاتی رہتی تھی، اسی زمانے کا یہ خط ہے جو کہ ۱۹۳۷ء کا لکھا ہوا ہے۔

(۲) مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی مرحوم (سابق امیر جماعت اسلامی ہند) جو اس وقت "فاران" کے ایڈیٹر تھے۔

(۳) اس سے مراد مکتوب الیہ کی ذات گرامی ہے۔

(۴) پرانے چراغ ص ۳۴۰۔۳۴۱

رئیس احمد جعفری ندوی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں : (۱)

محبّ مکرم جناب حکیم نصیر الدین ندوی کی عنایت سے "ریاض" کا سیّد سلیمان نمبر، نظر سے گزرا، خوشی ہوئی، اور بے اختیار آپ کی خدمت میں مبارک باد پیش کرنے کو جی چاہا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا اجر دے، ہم وابستگان سیّد کی دلی دعائیں آپ کے ساتھ ہیں اور رہیں گی۔

استاذ مرحوم حضرت سیّد صاحب قبلہؒ پر ابھی بہت کچھ لکھا جائے گا، جو کہ چالیس برس اپنے بزرگوں، دوستوں ہم چشموں اور عزیزوں کی مرثیہ خوانی کرتا رہا، آج اس کی یاد میں جس قدر آنسو بہائے جائیں کم ہیں۔ اس کی خدمات کے اجاگر کرنے کے لیے جتنی صحبتیں بھی ترتیب دی جائیں، ان کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔

اس جامع و ہمہ گیر شخصیت کا ہم پر یہ حق ہے کہ اس کے کارناموں سے دنیا کو روشناس کرائیں، نہ جاننے والوں کو بتائیں کہ کیسی بیش بہا نعمت ہم سے چھن گئی۔

حق یہ ہے کہ پوری ملت اس غم میں سوگوار ہے تو بجا ہے۔ یہ سطریں آپ کے خاص نمبر کے رسید کے طور پر لکھ رہا ہوں اس وقت کوئی مضمون لکھنا مقصود نہیں، البتہ مجھے ندامت ضرور ہے کہ آپ کی ترتیب دی ہوئی "بزم سلیمانی" کی شرکت سے محروم رہا، انشاء اللہ زندگی رہی تو پھر کبھی یہ سعادت حاصل ہو جائے گی۔ (۲)

---

(۱) رئیس احمد جعفری ندوی کے نام یہ خط ۶/رجب ۷۳ھ کو نظامی دواخانہ "کراچی" پاکستان سے لکھا گیا ہے۔ مکتوب الیہ اس خط کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "ریاض" کا سلیمان نمبر دیکھ کر مسعود صاحب بہت خوش ہوئے تھے۔ بڑے مبالغے کے ساتھ داد دی تھی، ایک ایک مضمون پڑھا تھا اور بڑے شوق سے پڑھا تھا۔ وعدہ کیا تھا کہ فرصت ملی تو پھر خود بھی اپنے تاثرات سیّد صاحب پر قلم بند کریں گے۔ کالونی جانے سے دو تین دن پہلے حکیم صاحب کی معرفت ایک خط بھی لکھا تھا، اگر میں کہوں کہ یہ مسعود عالم مرحوم کی آخری تحریر تھی، تو ذرا بھی مبالغہ نہ ہو گا۔

(۲) چراغ راہ، مسعود عالم ندوی نمبر ص ۴۰

مولانا سیّد ابوالحسن ندوی کے نام خط کا اقتباس (۱)

محبت نامہ آیا گویا دل پژمردہ میں جان آ گئی۔ اللہ جانے آپ کی تحریر میں کیسی دلنوازی ہے کہ بار بار پڑھنے پر بھی سیری نہیں ہوتی۔ کاش آپ برابر اسی طرح لکھا کرتے تو مجھے شکایت نہ ہوتی اور اس "پردیس" میں ندوہ کی صحبتوں کا مزہ آجاتا، خیر میں تو عرصہ ہوا عہد رفتہ کی واپسی سے مایوس ہو چکا ورنہ یوں غرق ہو کر بھی بیڑوں کو اچھلتے دیکھا ہے۔

آپ نے مضمون کی تعریف کی، اسی خیال سے تسکین ہوتی ہے کہ دنیا میں ایک مسعود بے نوا ہی سر پھرا اور مجنوں نہیں۔ اس دشت میں اس کے ہمنوا اور بھی ہیں، علی میاں! کیا ایسا دن بھی آئے گا، جب ہم دیوانوں کی اکثریت ہوگی، شیروانی اور پائجامہ پہننے والے مسلمانوں کی نہیں!" ولیس ذالك علی الله ببعید"

پہلا باب ہے جو معارف کے ۵۰ صفحوں پر آئے گا، پوری کتاب اس سائز کے ۲۰۰ صفحوں سے زائد نہ ہوگی، کتاب تکمیل کے قریب ہے، خوشی کی بات ہے کہ سیّد صاحب قبلہ نے سلسلہ دارالمصنفین میں چھاپنے کی ہامی بھر لی ہے، لکھنا اور لکھنے کے بعد پھر بیچنا اور چھاپنا یا چھپانا اور بیچنا مستقل درد سر ہے۔"(۲)

---

(۱) خدا بخش لائبریری پٹنہ سے ۶۰/۵/۶ھ کو لکھا گیا ہے۔

شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی پر مسعود صاحب نے ایک اہم مضمون معارف میں لکھا، مکتوب الیہ نے اسی مضمون پر داد دی تھی۔ اسی کا جواب مذکورہ بالا خط ہے۔

(۲) پرانے چراغ ص ۳۳۸۔۳۳۹

نعیم صدّیقی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں : (۱)

آپ نے میری کسی رائے پر پوچھا تھا کہ کیا تم اپنے خلاف سن سکتے ہو؟ اور اختلاف برداشت کر سکتے ہو؟ میں اس وقت ایک دوسری ادھیڑ بن میں تھا، اس لیے جواب نہ دے سکا، بلکہ اچھی طرح سوال سمجھ بھی نہ سکا تھا۔

اب خوش دلی کے ساتھ عرض ہے کہ آپ میری ذات، تحریر، اور افکار، جس پر جو نقد کرنا چاہیں، بخوشی کر سکتے ہیں۔ انشاء اللہ شکر گزار ہوں گا۔ جو عیوب ہوں گے، قبول کروں گا، جو نہ ہوں گے، ان سے برات کی کوشش کروں گا، جو باتیں قابل توجیہ ہوں گی، ان کی توجیہ بھی کی جائے گی، بلکہ آپ یہاں آئیں (عنایت الرحمٰن کی خواہش بھی ہے) اور مجھے اندر سے دیکھیں، اور پھر نقد کریں، کھلم کھلا اور میرے رفیقوں کے سامنے!

.... اور آپ مجھ پر جو تنقید بھی کریں، انشاء اللہ ممنون ہوں گا، غور کروں گا، اگر اس میں کوئی کام کی بات ملی۔ (۲)

---

(۱) نعیم صدیقی کے نام یہ خط ۶۵/۶/۵ھ کو دارالعروبۃ "جالندھر" سے لکھا گیا ہے، کسی خاص سلسلۂ گفتگو میں نعیم صدیقی نے مولانا سے عرض کیا کہ آپ کم سے کم تنقید تو برداشت کر سکتے ہیں، اپنے خلاف کچھ سن تو سکتے ہیں، چنانچہ اسی جواب میں مسعود صاحب نے ان کو خط لکھا، اور اپنے آپ کو فراخدلی سے تنقید کے لیے پیش کر دیا، اسی خط کا یہ ایک اقتباس ہے۔

(۲) چراغ راہ، مسعود عالم ندوی نمبر ص ۸ ---

مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی کے نام ایک خط کا اقتباس!(۱)

آپ کی یاد کس کس تقریب سے آتی ہے؟ کیا کہوں؟ میرا یہ عقیدہ ہے کہ آپ عبدالسلام صاحب (۲) اور مسعود سے زیادہ دنیا میں کوئی تین آدمی ہم خیال نہیں ہو سکتے۔ لیکن کس قدر تکلیف کی بات ہے کہ ایک الگ غیر اور اجنبی ماحول میں پڑا ہوا ہے۔

بہر حال یقین رکھئے کہ میں یہاں جب تک رہوں گا "ندویت" مخصوص قسم کی "وہابیت" اور "عربیت" پھیلاتا رہوں گا۔ خواہ اس راہ میں شہید کیوں نہ ہو جاؤں۔" (۳)

---

(۱) یہ خط خدا بخش لائبریری پٹنہ سے ۲۱/ذی قعدہ ۵۶ ھ کو لکھا گیا ہے۔

(۲) مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی، سابق ناظم دینیات جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

(۳) پرانے چراغ ص ۳۳۴

باب ششم

مولانا مسعود عالم ندوی

چند اہم تصانیف کا تعارف

محمد بن عبدالوہّاب ایک مظلوم اور بدنام مصلح

اس کتاب کا موضوع علمی، تاریخی اور تحقیقی ہے، اور "ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک" کی ضمنی تخلیق کہا جاسکتا ہے۔ مصنف کو اس کتاب کے مواد کی فراہمی کے دوران تحریک نجد کے مطالعے کی ضرورت پیش آئی، اور اس میں انہیں اس قدر انہماک ہوا کہ انہوں نے پہلے عبدالوہاب کی سیرت و دعوت پر ہی قلم اٹھالیا۔ کتاب کو علامہ سیّد سلیمان ندوی مرحوم کے نام منسوب کیا ہے، چنانچہ کتاب کے شروع میں لکھتے ہیں :

> "اپنے استاذ، مربی اور مخدوم حضرت مولانا سیّد سلیمان ندوی کے نام جن کی پدرانہ شفقت میری زندگی کے اتار چڑھاؤ کی نگہبان رہی ہے، اور جن کی سرپرستی اور قیمتی مشوروں نے مجھ میں لکھنے پڑھنے کا مذاق پیدا کیا اور اپنی طالب علمی کے گزشتہ بارہ تیرہ برسوں میں جن کی ہدایتوں کا یکسر پابند رہا ہوں، اس حقیر طالب علمانہ کوشش کو معنون کرنے کی عزت حاصل کرتا ہوں۔" (۱)

یہ کتاب مولانا نے اس زمانے میں ترتیب دی، جبکہ ہر طرف اس تحریک کی غلط تاویلیں کر کے عوام کو گمراہ کیا جارہا تھا، حتیٰ کہ بڑے بڑے علماء بھی اس تحریک سے پوری طرح واقف نہ تھے، اور وہ بھی مخالفین کی ہاں میں ہاں ملاتے تھے۔ چنانچہ مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی رقم طراز ہیں :

> "شیخ محمد بن عبدالوہاب ہمارے دینی حلقوں میں جس قدر بدنام ہیں، وہ کسی سے مخفی نہیں، انگریزوں اور ترکوں نے اور علمائے حجاز نے اپنی اپنی مصلحت سے ان کے متعلق جو کچھ مشہور کردیا، ہمارے علماء نے بلا تحقیق و تفتیش تسلیم کرلیا، اور کسی نے براہ راست اُن کی تصانیف اور

---

(۱) محمد بن عبدالوہاب ایک مظلوم اور بدنام مصلح

ان کے حالات کے صحیح مآخذ کے مطالعے کی زحمت گوارہ نہیں کی، ضرورت تھی کہ کوئی مرد حق شناس ان کے صحیح حالات و خیالات پیش کرتا، تاکہ اہل علم و طالبین حق کو صحیح رائے قائم کرنے کا موقع ملتا۔ علمائے نجد اور شیخ کے جانشینوں نے تو متعدد کتابیں لکھیں، اور وہ حجاز و مصر میں شائع ہو چکی ہیں، لیکن اردو میں کوئی کتاب نہ تھی۔

مسعود صاحب نے اس بدنام مظلوم مصلح کی سیرت نگاری کا بیڑا اٹھایا، اور خاص مؤرخانہ اور محققانہ حیثیت سے ان کی سوانح، ان کی تحریک اور دعوت کی تاریخ مرتب کرنی شروع کی۔"(۱)

اس کتاب کو مولانا نے اگرچہ ۶۱ھ میں مرتب کیا، لیکن موصوف نے ۵۴ھ ہی سے اس تحریک کا مطالعہ شروع کر دیا تھا، جیسا کہ کتاب کے آغاز میں لکھا:

"تلاش و جستجو کے ابتدائی نمونے مرحوم "الضیاء" شعبان ۵۴ھ میں الحركة الوهابية السياسية" کے عنوان سے اور الہلال پٹنہ میں وہابیت ایک دینی اور سیاسی تحریک کی سرخی کے تحت شائع ہوئے اور مخصوص حلقوں میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھے گئے۔"(۲)

اس کے بعد بھی مولانا نے اس موضوع پر چھان بین جاری رکھی، اور وہابی تحریک کو سمجھنے میں تلاش و جستجو کے دریا پار کیے، دوران مطالعہ ایسی غلط بیانیوں سے واسطہ پڑا کہ ان کی تحریک و دعوت پر مکمل کتاب لکھے بغیر سکون نصیب نہ ہو سکا۔ اس شاہکار تصنیف کی مختصر سرگزشت خود مولانا کے الفاظ میں پڑھیے، لکھتے ہیں:

"۳۵ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے دو طالب علموں نے یہ ارادہ کیا

---

(۱) پرانے چراغ، مصنف مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ص ۳۳۸

(۲) محمد بن عبدالوہاب ایک مظلوم اور بدنام مصلح ص ۲

کہ حضرت سیّد احمد شہید بریلوی اور مولانا اسماعیل شہید (رحمھا اللہ رحمۃ الابرار الصالحین المجاھدین من عبادہ) کی چلائی ہوئی تحریک تجدید و امامت کی مکمل تاریخ مرتب کی جائے، ایک نے حضرت سیّد صاحب کی سیرت اپنے ذمہ لی، اور دوسرے نے بالاکوٹ کے مشہد سے اپنا سفر شروع کرنے کا ارادہ کیا دونوں نے اپنا اپنا کام شروع کیا، ان میں جو باہمت، صاحب دل اور سراپا اخلاص و جہاد تھا، اس نے سیرت سیّد احمد شہید مرتب کی (۳۹ء)

میرا اشارہ اپنے مخلص دوست مولانا ابوالحسن علی ندوی (استاذ تفسیر و ادب دار العلوم ندوۃ العلماء) اور ان کی تصنیف سیر تسیّد احمد شہید کی طرف ہے، جو اہل ذوق کے ہاتھوں میں پہنچ چکی ہے، اور ایک قلیل مدت میں اس کے دو ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ دوسرے راقم نے بھی اپنا کام شروع کیا لیکن قدم قدم پر رکاوٹیں پیش آئیں، نشان راہ دھندلا ہو چکا تھا، جاننے والے اور دیکھنے والے ابدی نیند سو چکے تھے، لیکن قلم کا مسافر اپنی منزل کو نہیں بھولا۔

دوران بحث و تمحیص میں نجد کی وہابی تحریک (جیسا کہ عام طور پر کہا جاتا ہے) کا ذکر بار بار نظر سے گزرا، اور ایسی غلط بیانیوں اور افترا پردازیوں سے دوچار ہوا کہ یارائے ضبط نہ رہا، سب سے بڑی غلط فہمی جس میں دوست اور دشمن دونوں مبتلا ہیں یہ ہے کہ ہندوستان کی تحریک وہابیت یعنی حضرت سیّد صاحب کی تحریک تجدید و امامت نجد کی وہابی تحریک ہی کی ایک شاخ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ دونوں تحریکوں کا مآخذ ایک، مقصد ایک اور دونوں کے چلانے والے کتاب و

سنت کے علمبردار اور یکساں سرگرم مجاہد تھے، لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ پر بالکل اٹل ہے کہ ایک کا دوسرے سے دور کا بھی تعلق نہیں، یعنی ایک نے دوسرے کی تعلیمات سے بالکل فائدہ نہیں اٹھایا دونوں دعوتیں الگ الگ اپنے مخصوص ماحول اور حالات کے مطابق پھلیں پھولیں، اس لیے اصولی اتحاد (یعنی کتاب و سنت کی طرف لوٹنے کی دعوت) کے باوجود دونوں پر اپنے اپنے مخصوص مقامی اثرات کی چھاپ بھی محسوس ہوتی ہے، اور جزئیات میں ایک دوسرے سے کافی اختلاف بھی رکھتی ہیں۔

ہم نے ابھی کہا کہ نجد کی تحریک دعوت و تجدید کے متعلق ایسی غلط بیانیاں نظر سے گزریں کہ یارائے ضبط نہ رہا اور اسی بے اختیاری میں عاجز نے زیر ترتیب کتاب کے دو حصے کر دیے۔

شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب نجدی کی سیرت اور دعوت کے متعلق یہ صفحے، اس مجوزہ کتاب کی پہلی جلد کی حیثیت رکھتے ہیں، دوسری جلد ہندوستان کی تحریک تجدید و امامت کی مکمل تاریخ پر مشتمل ہوگی، جس میں حضرت سیّد صاحب کی شہادت ۱۲۴۶ھ مطابق ۱۸۳۱ء سے لے کر ۱۸۷۱ء تک کی تمام سرگرمیوں، قربانیوں اور خدمات کا گہرا جائزہ لینے کی کوشش کی جائے گی۔"(۱)

اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ مولانا مسعود عالم ندوی کو سیّد احمد شہید کی تاریخ بالاکوٹ کے مشہد سے قلم بند کرنا تھی یعنی محمد بن عبدالوہاب نجدی کی سیرت لکھنے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ لیکن دوران مطالعہ محمد بن عبدالوہاب نجدی کی دعوت اور تحریک کو بھی دیکھنے

---

(۱) محمد بن عبدالوہاب ایک مظلوم اور بدنام مصلح۔ از مسعود عالم ندوی ص ۳

کا موقع ملا اور سیّد احمد شہید اور محمد بن عبد الوہاب نجدی کی تحریکوں کا ایک تقابلی مطالعہ خود بخود موضوع کی مناسبت سے شروع ہوا تو دوران مطالعہ محمد بن عبد الوہاب نجدی کی تصویر ایک مظلوم اور بدنام مصلح کی شکل میں نظر آئی، اور ان کے بارے میں غلط بیانیوں اور افترا پردازیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ نظر آیا۔ لہٰذا ان کے ضمیر نے انہیں پہلے عبد الوہاب نجدی کی دعوت و تحریک پر لکھنے کے لیے اکسایا اس طرح سے یہ کتاب منصۂ شہود پر آ سکی۔ مولانا مسعود عالم ندوی جیسا کہ سب جانتے ہیں، ایک وسیع ذہن کے آدمی تھے، تنگ نظری سے کوئی واسطہ نہ تھا، ہر تحریک کو کتاب و سنت پر پرکھتے تھے، اور صرف کسی ایک تحریک یا جماعت کو اسلام کا صحیح داعی نہ سمجھتے تھے بلکہ جو بھی تحریک یا جماعت کتاب و سنت کے مطابق کام کرتی، اس کو صحیح سمجھتے، چاہے کسی بھی مکتبۂ فکر سے اس کا تعلق کیوں نہ ہو۔

چنانچہ محمد بن عبد الوہاب نجدی یا سیّد احمد شہید کی تاریخ مرتب کرنے کی غرض و غایت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ”نجدی وہابیت یا ہندوستانی وہابیت کی تاریخ مرتب کرنے سے ہماری غرض اس بات کی تبلیغ نہیں کہ حق و صداقت انہیں دو جماعتوں میں محدود ہیں، یا یہ کہ مختلف ادبی و مذہبی اسکولوں کی طرح ان جماعتوں کو ہم ایک خاص مشرب یا اسکول کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ ان جماعتوں کے بعض سرگرم داعیوں یا پرجوش معتقدوں کا ایسا خیال ہو۔ لیکن ہم اس تحزب کو اسلام اور مسلمانوں کے حق میں حد درجہ مضر سمجھتے ہیں، ہمارے نزدیک حق صرف کتاب و سنت کی پیروی میں ہے، ہم رشد و ہدایت کو کسی فقہی مدرسہ یا ملکی جماعت کا اجارہ نہیں سمجھتے۔ یہ نہ نجد کی زر خرید ہے نہ ہندوستان کی۔ اللہ اور اس

کے رسول ﷺ کی تعلیمات واضح اور نمایاں ہیں، جو ان پر ٹھیک ٹھیک چلے گا وہ ہدایت وفلاح سے شاد کام ہوگا۔

یعنی ہم حق کو نہ ائمہ اربعہ کی تقلید میں محصور سمجھتے ہیں نہ دیو بند، ازہریا ندوۃ العلماء کے شیوخ اور اکابر کی پیروی میں، اور نہ پیشوائی کو کسی خاندان یا ملک کا موروثی حق خیال کرتے ہیں۔

نجد اور ہندوستان کی ان دونوں جماعتوں کی تاریخ مرتب کرنے اور ان کے دھندلے نقوش کے اجاگر کرنے سے ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ بارہویں اور تیرہویں صدی کے دو مشہور مصلحوں اور ان کے نقش قدم پر چلنے والوں کی سیرت ہماری آنکھوں کے سامنے آجائے، ہم یہ بھی نہیں سمجھتے کہ ان صدیوں میں صرف یہی دو مصلح پیدا ہوئے، ہندوستان میں شاہ ولی اللہ دہلوی (۱۱۱۴ھ۔۱۱۷۶ھ) اور طرابلس میں محمد بن علی سنوسی (۱۲۰۲ھ مطابق ۱۷۸۷ء۔ ۱۲۷۶ھ مطابق ۱۸۶۰ء) بھی اپنی شان تجدید واصلاح کے لحاظ سے انتہائی ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔

گو کہنے والے کہیں گے کہ سیّد صاحب کی دعوت حضرت شاہ صاحب ہی کی پکار کی آواز بازگشت تھی، مگر یہ مان لینے کے بعد بھی سیّد صاحب کا خاص رنگ اور انفرادی خصوصیات اپنی جگہ پر باقی رہتی ہیں، اسی طرح اصلاح وتجدید کے دوسرے رنگ میں سیّد جمال الدین افغانی (ف ۱۳۱۵ھ مطابق ۱۸۹۷ء) اور امیر عبدالقادر جزائری (ف ۱۳۰۰ھ مطابق ۱۸۸۳ء) بھی ایک بڑی جماعت کی عقیدت ومحبت کا مرکز بنے ہوئے ہیں، اور بجا طور پر اس طرح ہم یہ بھی نہیں سمجھتے کہ نجد اور ہندوستان

کی یہ دونوں جماعتیں معصوم ہیں، اور ان سے غلطیاں اور کوتاہیاں نہیں ہوئیں۔ اہل نجد کے بارے میں تو غلو اور شدت کا شکوہ دوستوں کو بھی ہے، ہمارا کہنا صرف یہ ہے کہ یہ مخلص جماعتیں تھیں، جو اللہ کے نام پر اٹھیں اور جہاں تک انسانی کوششوں کا تعلق ہے، اعلائے کلمۃ اللہ میں انہوں نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی، آپ اس نظر سے ان کے کاموں کا جائزہ لیجئے، سنی سنائی باتوں، دشمنوں اور جاہل مولویوں اور صوفیوں کے پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر غلط رائے قائم کر لینا طالب حق کا شیوہ نہیں ہو سکتا۔" (۱)

اس کتاب کو مولانا نے چھ ابواب میں منقسم کیا ہے، پہلے باب میں محمد بن عبدالوہاب کے ذاتی حالات، تعلیم، نشو و نما، دعوت و وفات کا تفصیلی ذکر ہے، نیز ان کے پیدائش کے وقت دنیائے اسلام کی حالت کو بھی قلم بند کیا ہے۔

دوسرے باب میں اس تحریک کے سیاسی جدوجہد کے پہلو سے بحث کی ہے، صلح و جنگ، فتح و معاہدہ اور سیاسی اثرات کا ذکر بھی کیا ہے۔

تیسرے باب میں شیخ کی تصانیف اور علمی کارناموں کا ذکر ہے اور شیخ کی تصنیفات کا تعارف کرایا ہے، کسی کا مختصر اور کسی کا تفصیلی۔

چوتھے باب میں شیخ کے فقہی مسلک کی وضاحت کی ہے۔

پانچویں باب میں شیخ اور تحریک کے متعلق غلط فہمیوں کا علمی محاسبہ کر کے ان کی تردید کی ہے۔

چھٹا باب اس کتاب کا اہم باب ہے، اس باب میں مولانا نے ان مآخذ اور لٹریچر کا ذکر کیا ہے۔ جن کا اس کتاب کے سلسلے میں انہیں مطالعہ کرنا پڑا۔ اس میں صرف کتابوں

---

(۱) محمد بن عبدالوہاب، ایک مظلوم و بدنام مصلح۔ از مسعود عالم ندوی ص ۵

کے ناموں کا حوالہ ہی نہیں دیا ہے، بلکہ ہر کتاب کا تفصیلی جائزہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ یعنی کتاب کے مصنف کا نام اور علمی مقام، طباعت کا سال، مطبع کا نام، کتاب کے قلمی نسخوں کی تفصیل، کن کن علماء نے کتاب پر شرحیں لکھیں اور وہ کن کتب خانوں میں موجود ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

مولانا نے اس باب میں ۳۹/ انگریزی اور عربی کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ جن کا انہوں نے حرف بہ حرف بہت باریک بینی سے مطالعہ کیا ہے اور جہاں کہیں قلمی نسخے کے بارے میں پتہ چلا، وہاں جاکر اس قلمی نسخے کا مطالعہ کیا۔

اس کے علاوہ عربی کی ان ۲۴/ مختصر کتابوں کا بھی مآخذ میں ذکر کیا ہے، جن کا انہوں نے مطالعہ کیا، اور شیخ کی دعوت کو سمجھنے میں ان سے مدد لی۔ ان ۲۴/ کتابوں کا صرف نام اور طباعت کی تاریخ اور مصنف کی تاریخ وفات کا ذکر درج ہے۔

گویا یہ ایک مستند کتاب ہے، جس کو انتہائی تحقیق و تفتیش کے بعد مرتب کیا گیا ہے۔

بقول مولانا امین احسن اصلاحی صاحب:

> "تحقیق و تفتیش کا یہ ایک ایسا عمدہ مجموعہ ہے کہ اس موضوع پر اتنی مبسوط کتاب اردو زبان میں میری نظر سے نہیں گزری۔"(۱)

---

(۱) چراغ راہ کراچی، مسعود عالم ندوی نمبر ۱۹۵۵ء ص ۱۸۸

مولانا سندھی اور ان کے افکار و خیالات پر ایک نظر

یہ کتاب مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کے دو مضامین کا مجموعہ ہے، جس میں سے ایک مضمون مولانا سندھی مرحوم کی کتاب "شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک" کے بعض افکار و خیالات کی تردید اور تصحیح میں لکھا گیا اور دوسرا پروفیسر محمد سرور کی کتاب "مولانا عبید اللہ سندھی اور ان کے افکار و خیالات" کے جواب میں سپرد قلم کیا گیا۔ بعد میں یہ دونوں مضامین کتابی شکل میں شائع ہوئے۔ کتاب کے شروع میں مولانا لکھتے ہیں:

> "زیر نظر کتاب میں راقم کے دو مضمون شائع ہو رہے ہیں، جو اس نے مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم و مغفور کی کتاب "شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک" اور پروفیسر محمد سرور کی کتاب "مولانا عبید اللہ سندھی اور ان کے افکار و تعلیمات" پر تنقید اور استدراک کے طور پر لکھے تھے۔" (۱)

اس کتاب کا مقدمہ علامہ سیّد سلیمان ندوی مرحوم و مغفور نے تحریر فرمایا ہے جس سے کتاب کی افادیت میں مزید اضافہ ہوا ہے۔ بقول مولانا مسعود عالم ندوی:

> "انہوں نے (سیّد سلیمان ندوی) خادم کی درخواست پر ایک بے لاگ اور دل نشیں مقدمہ تحریر فرما کر کتاب کی عزت بڑھائی اور ناظرین کتاب کے لیے بصیرت اور روشنی کا سامان فراہم کیا۔" (۲)

اپنی کتاب میں مولانا سندھی مرحوم نے شاہ ولی اللہ کی علمی تحریک کو اکبر کے دین الٰہی کی علمبردار اور اس کے کارناموں کو پایہ تکمیل تک پہنچانے والی قرار دیا ہے۔ جو ایک لغو اور بے ہودہ بات ہے۔ اور حقیقت سے اس کا ذرہ برابر بھی تعلق نہیں ہے۔

---

(۱) مولانا سندھی اور ان کے افکار و خیالات پر ایک نظر، مصنف مولانا مسعود عالم ندوی ص ۱۴

(۲) ایضاً ص ۲۴

بقول سید سلیمان ندوی مرحوم و مغفور:

"جن شاہ ولی اللہ صاحب کو اکبر کے ناتمام کام کا تکمیل کرنے والا بتایا جاتا ہے ان کا فتویٰ اکبر کے باب میں جو کچھ ہے وہ ان کی کتاب "انفاس العارفین" کے اس فقرے سے ظاہر ہے۔

"جلال الدین اکبر پادشاہ اورا معظم و مفخم داشتے، و بعد ازاں کہ پادشاہ الحادو زندقہ گرفت، آں رشتۂ الفت از ہم گسست، و تنفر تمام از ہر دو جانب بظہور پیوست۔"(۱)

اسی طرح سیّد احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کی تحریک اور ان کے رفقاء کے حالات کے بارے میں بڑی غلط بیانی اور زیادتی سے کام لیا گیا تھا اور خاص کر اہل صادق پور کے حالات کے بیان کرنے میں بڑی مبالغہ آمیزی کی تھی۔

لہٰذا ضرورت اس بات کی تھی کہ کوئی پوری متانت و سنجیدگی کے ساتھ مدلل انداز میں ان کے افکار کا جواب دے، اور یہ سعادت مولانا مسعود عالم ندوی کے حصے میں آئی۔

بقول علامہ سیّد سلیمان ندوی مرحوم:

"پورے ملک میں سے صرف مولانا مسعود عالم صاحب کو اللہ تعالیٰ نے توفیق بخشی کہ انہوں نے مولانا سندھی کی زندگی ہی میں ان کی تردید میں پر زور مضامین لکھے اور پوری متانت اور تحقیق اور سنجیدگی کے ساتھ ان کے افکار کی تنقید کی۔"(۲)

سیّد احمد شہیدؒ اور ان کے رفقاء کے بارے میں مولانا سندھی نے بڑی زیادتی سے کام لیا ہے۔

اسی لیے مولانا مسعود عالم ندوی کتاب کے ابتداء ہی میں لکھتے ہیں:

---

(۱) مولانا سندھی اور ان کے افکار و خیالات پر ایک نظر۔ مصنف مولانا مسعود عالم ندوی ص:۱۶

(۲) ایضاً ص:۲۲

"دنیا میں مظلومیتوں کی داستان بار بار دہرائی گئی ہے۔ تاریخ میں میدان جنگ کے ابتلاء کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا گیا ہے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اسلامی ہند کی تاریخ میں بعض اکابر امت کی مظلومیت میدان شہادت کی مظلومیت پر بھی بازی لے گئی ہے۔ اور زیادہ تکلیف دہ بات یہ ہے کہ اس خون کی چھینٹیں ان کے ماننے والوں اور نام برداروں کے دامن پر بھی ہیں۔

جہاں تک تاریخی واقعات وحقائق کا تعلق ہے، یہ بات بلاخوف وتردید کہی جاسکتی ہے، کہ حضرت سیّد احمد شہید بریلوی (۱۲۰۱ھ مطابق ۱۷۸۶ء۔ ۱۲۴۶ھ مطابق ۱۸۳۱ء) اور ان کے اصحاب سے پہلے اس خطۂ ارض میں کسی صحیح دینی تجدید وانقلاب کے لیے کوئی منظّم اور ہمہ گیر کوشش نہیں کی گئی، اور ہندوستان تو ہندوستان، ساری دنیا میں عہد صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے بعد کوئی جماعت طریق نبوت اور اسوہ نبوی سے اتنی قریب اور ہم آہنگ نظر نہیں آتی۔ لیکن حالات اور ماحول کی ستم ظریفی یہ ہے کہ غیر تو غیر اپنوں میں بھی سیّد صاحب اور ان کے مخصوص احباب کا فکر بلند، معتدل مزاج ومشرب اور مسلک وعمل میں عجیب وغریب توازن پورے طور پر نہیں سمجھا گیا۔ ہر فریق نے اپنے ظن وتخمین کے مطابق انہیں اپنانے کی کوشش کی، نتیجہ یہ ہوا کہ اس کھینچا تانی میں وہ "فکر بلند" تو آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ اور ان کے ماننے والوں اور پیروی کا دم بھرنے والوں میں تقلید وعدم تقلید، آمین، رفع یدین، دیہاتوں میں نماز جمعہ اور اسی قسم کے چند فروعی مسئلے لڑنے جھگڑنے کے لیے رہ

گئے آغاز کیا تھا، انجام کیا ہوا، دیدہ عبرت روا ہو تو بہت کچھ سیکھا جا سکتا ہے۔..........

مگر جب خود اپنی جماعت کے ممتاز اصحاب فکر ان نفوس قدسیہ کے منہ آئیں، ان کی پاک نیتوں پر حملے کریں، ان کے ضرب المثل اخلاص پر شک کریں، تو پھر خواہ مخواہ، صبر و تحمل کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے لگتا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ یہ وقت بڑی آزمائش کا ہوتا ہے، ایک طرف یہ خیال کہ بزرگوں کی غلطیوں پر نکتہ چینی، کہیں بے ادبی نہ شمار کی جائے، عرض مدعا سے روکتا ہے، دوسری طرف احساس فرض اور یہ خوف کہ اگر سکوت سے کام لے کر غلطیوں کی تصحیح نہ کی گئی تو کہیں بزرگوں کی یہ لغزش آگے چل کر تاریخی حقائق نہ بن جائیں، اظہار مطلب پر اکساتا ہے۔ یوں تو مروت اور صداقت کی کش مکش ہمیشہ صبر آزما ہوا کرتی ہے، لیکن راقم کے لیے اس تحریر کے سلسلے میں یہ کش مکش بہت طویل اور تکلیف دہ رہی۔ آخر دو تین مہینوں کی ذہنی الجھن کے بعد دل و دماغ نے اظہار مطلب ہی کے حق میں فیصلہ کیا۔ اور زبان قلم نے بسم اللہ کہہ کر استدراک کی بسم اللہ کی۔(۱)

پھر آگے چل کر "استدراک و تنقیح" کے لکھنے کا مقصد بیان کرتے ہیں اور مختصراً سیّد احمد شہیدؒ اور خصوصاً اہل صادق پور کے ساتھ مولانا عبید اللہ سندھی کی زیادتی اور غلط بیانی کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"حضرت سیّد احمد شہید کو حزب ولی اللہ کی تاریخ میں بالکل ضمنی حیثیت دی گئی ہے اور ان کے خاص ماننے والوں اور سالہا سال تک علم جہاد بلند کرنے والوں کے لیے تو اس خاکے میں کوئی گنجائش ہی نہیں۔ اسلامی ہند کی پہلی اور (اب تک) آخری تحریک تجدید و انقلاب میں سیّد

(۱) مولانا سندھی اور ان کے افکار و خیالات پر ایک نظر، مصنف مولانا مسعود عالم ندوی ص ۲۔۳

صاحب کو ضمنی حیثیت دینا حقیقت و صداقت کا خون کرنا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ مولانا سندھی نے اس باب میں سیّد شہید کے ساتھ بڑی بے انصافی کی ہے، اور پھر امیر شہید (مولانا کی اصطلاح کے مطابق) کی اس ضمنی حیثیت کو بجا ثابت کرنے کے لیے، ان کی طرف طرح طرح کی باتیں منسوب کی گئی ہیں، اور اسی پر بس نہیں تحریک کے دوسرے دور میں مولانا محمد اسحاق سے مولانا محمود الحسن تک مختلف افراد کی مسلسل امارت و امامت ثابت کرنے کے لیے سیّد شہیدؒ کے جاں نثاروں۔ پورب کے سرفروش مجاہدوں اور شہیدوں، سرکار انگریز کے ممنون التفات اہل صادق پور (۱) بدنام وہابیوں اور عام جماعت اہل حدیث کو زیدیت، شیعیت، رفض اور مختلف القاب سے اس بے دردی کے ساتھ نوازا گیا ہے کہ حیرت ہوتی ہے اور رہ رہ کر تعجب ہوتا ہے کہ ایک وسیع النظر عالم اور ممتاز صاحب فکر کے قلم سے ایسی لغزشیں کیوں کر ہوئیں؟ اور اسی لپیٹ میں یمن کے سلفی عالم و محدث قاضی محمد بن علی شوکانی (ف ۱۲۵۰ھ ۱۸۳۴ء) اور نجد کے مظلوم مصلح شیخ محمد بن عبدالوہاب (ف ۱۲۰۶ھ ۱۷۹۲ء) اور ان کے متبعین بھی آ گئے ہیں۔ زیر تحریر استدراک کا مقصد ان ہی مظالم کا مداوا کرنا ہے۔" (۲)

---

(۱) صادق پور، شہر عظیم آباد پٹنہ کا ایک محلہ ہے۔ یہاں کا ایک ہاشمی خاندان عرصہ دراز سے علم و فضل میں ممتاز رہا ہے۔ حضرت سیّد احمد شہیدؒ نے جب علم جہاد بلند کیا تو اس خاندان کے ایک ممتاز فرد مولانا ولایت علی (ف ۱۲۶۹ھ مطابق ۱۸۵۲ء) لبیک کہنے والوں کی صف اول میں تھے۔ اور پھر ان کی تبلیغ سے پورا خاندان سیّد صاحب اور ان کی دعوت کا علم بردار ہو گیا، اور اس سلسلے میں ان لوگوں نے وہ کچھ کر دکھایا۔ جو رہتی دنیا تک یاد رہے گا۔

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

مختصر طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ سیّد صاحب کی شہادت (۱۲۴۶ھ مطابق ۱۸۳۱ء) سے لے کر ۱۸۷۱ء تک حکومت کی دار و گیر کے باوجود مسلسل چالیس سال تک صادق پور والوں نے جہاد کا علم سرنگوں نہیں ہونے دیا۔ پھانسی، جلاوطنی حبس دوام اور ہر قسم کی ممکن اذیتیں، انہیں دی گئیں لیکن یہ راہ حق سے نہ ہٹے۔

(۲) مولانا سندھی اور ان کے افکار و خیالات پر ایک نظر۔ مصنف مولانا مسعود عالم ندوی، ص ۵-۶

ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک

یہ بھی مولانا کی ایک اہم کتاب ہے، اور اس کتاب کو انہوں نے "محمد بن عبد الوہاب ایک مظلوم اور بدنام مصلح" کے بعد ترتیب دیا۔ جس وقت مولانا اس کتاب کو ترتیب دینے کے لیے مطالعے اور بحث و تمحیص میں مشغول تھے، انہیں دوران مطالعہ نجدی وہابی تحریک کے بارے میں ایسی ایسی غلط بیانیاں دیکھنے کو ملیں کہ انہیں یارائے ضبط نہ رہا، اس لیے پہلے نجدی تحریک پر کتاب ترتیب دی، اس کے بعد یہ کتاب لکھی جو ان کا اصل مقصد تھا۔ اور جس کا ارادہ انہوں نے اور مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی نے ندوۃ العلماء ہی میں کیا تھا، جیسا کہ لکھتے ہیں:

> "۳۵ءمیں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے دو طالب علموں نے یہ ارادہ کیا کہ حضرت سیّد احمد شہید بریلوی اور مولانا اسماعیل شہیدؒ کی چلائی ہوئی تحریک تجدید و امامت کی مکمل تاریخ مرتب کی جائے، ایک نے حضرت سیّد صاحب کی سیرت اپنے ذمہ لی اور دوسرے نے بالاکوٹ کے مشہد سے اپنا سفر شروع کرنے کا ارادہ کیا، دونوں نے اپنا اپنا کام شروع کیا، ان میں جو باہمت، صاحب دل اور سراپا اخلاص و جہاد تھا۔ اس نے سیرت سیّد احمد شہید مرتب کی (۳۹ء) میرا اشارہ اپنے مخلص دوست مولانا ابوالحسن علی ندوی (استاذ تفسیر وادب دارالعلوم ندوۃ العلماء) اور ان کی تصنیف سیرت سیّد احمد شہید کی طرف ہے، جو اہل ذوق کے ہاتھوں میں پہنچ چکی ہے۔ اور ایک قلیل مدت میں اس کے دو ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ دوسرے راقم نے بھی اپنا کام شروع کیا، لیکن قدم قدم پر رکاوٹیں، پیش آئیں۔ نشان راہ دھندلا ہو چکا تھا۔ جاننے والے اور دیکھنے والے ابدی نیند سو چکے تھے، لیکن قلم کا

مسافر اپنی منزل کو نہیں بھولا۔"(۱)

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"بحث و مذاکرہ کے بعد دو دوستوں کے درمیان یہ طے پایا کہ علی میاں سیّد صاحبؒ کی سیرت کو مرتب کریں، اور یہ گنہگار مشہد بالاکوٹ (۱۲۴۶ھ ـ ۱۸۳۰ء) سے اپنا قلمی سفر شروع کرے۔"(۲)

اس کتاب میں مشہد بالاکوٹ کے بعد کے واقعات اور حالات کا جائزہ ہے، لیکن ابتداء میں سیّد احمد شہیدؒ کی سیرت اور وہابیت پر بھی دو باب لکھے ہیں۔اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"گو اس رسالے کا اصل موضوع ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک اور اس میں بھی خاص کر مشہد بالاکوٹ کے بعد کے واقعات و حالات کی شہرت کے باعث حضرت سیّد احمد شہید کی سیرت اور وہابیت پر دو باب شروع میں بڑھا دیے گئے ہیں۔ ہر چند کہ لفظ "وہابیت" کا اطلاق دنیا کی کسی تحریک پر صحیح نہیں، نجد کی دعوت کے علم بردار شیخ الاسلام محمد احمد عبدالوہاب کی طرف اگر نسبت کرنا ہو، تو محمدی کہنا چاہیے، علاوہ بریں ان کے ماننے والے عام طور پر اپنے کو "حنبلی" کہتے ہیں۔ علمائے حنابلہ کی کتابوں پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ محمد بن عبدالوہاب نے ان سے زیادہ ایک حرف نہیں کہا البتہ عزم و عمل کی مردہ قوتوں کو بیدار ضرور کیا۔ بیدار پیکروں میں زندگی کی حرارت ڈال دی، اور ایک پورے خطے کو اسلامی رنگ میں شرابور کیا۔ اور آپ جانتے ہیں کہ یہ ایسا گناہ ہے، جسے شاطران فرنگ اور ان کے بہی خواہ معاف نہیں کر سکتے۔

---

(۱) محمد بن عبدالوہاب، ایک مظلوم اور بدنام مصلح، مسعود عالم ندوی ص ۳

(۲) ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک، از مولانا مسعود عالم ندوی ص ۵

نجد کے بعد وہابیت کا لیبل سیّد احمد شہید کے ماننے والے ہندوستانی مجاہدوں پر بھی لگایا گیا، جو بار بار کی تردید کے باوجود آج بھی قائم ہے۔ اور یہ گالی اتنی مشہور ہو چکی ہے کہ بعض اچھے خاصے مخلص مسلمان بھی، مجاہدین، کو "وہابی" ہی کے نام سے جانتے ہیں، اور اس سوختہ سامان نے تو اب تنگ آکر اس لقب "وہابی" سے گھبرانا بھی چھوڑ دیا ہے۔ اچھا صاحب اگر اللہ کا نام بلند کرنے اور اس کی راہ میں جان و مال کی قربانیوں کا نام "وہابیت" ہے تو ہم وہابی ہیں، چلئے چھٹی ہوئی۔" کتاب کے آغاز میں وہابیت پر چند صفحے اسی عذر کے ماتحت لکھے گئے ہیں۔ جو شاید اصحاب نظر کی نگاہ میں قابل قبول نہ ہوں۔"(۱)

مولانا کی کتابوں کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ عقیدت مندانہ نظریے سے صرف نظر کر کے بے باک اور بے لاگ ہو کر لکھتے ہیں۔ بہت سے علماء چاہتے ہوئے بھی پورے طور سے یہ صفت اپنے اندر پیدا نہیں کر پاتے ہیں، لیکن مولانا کی یہ صفت ان کی ہر کتاب میں پورے آب و تاب کے ساتھ دکھائی دیتی ہے۔ چاہے وہ کتاب مولانا عبیداللہ سندھی پر ہو یا محمد بن عبدالوہاب کے متعلق یا سیّد صاحب کی سیرت پر ہر کتاب میں مولانا نے بے لاگ تنقید کرنے کی جرات کی ہے۔ اس سلسلے میں مولانا خود رقمطراز ہیں:

"ہم ان نظریوں کی تنقید و تنقیح پر مجبور ہیں۔ جو کتاب و سنت کے صراط مستقیم سے ہٹے ہوئے ہیں۔ خواہ اس میں جذبات محبت و عقیدت ہی کو کیوں نہ ٹھیس لگتی ہو کہ حق کی تائید تعلقات و محبت کی پاسداری پر مقدم ہے۔

فالحـــق اولیٰ مـــن ولیك حرمـــة
واحـــق منك بنصـــرة وكفـــاح شـــوقی(۲)

---

(۱) ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک۔ از مولانا مسعود عالم ندوی ص ۷

(۲) مولانا سندھی کے افکار و نظریات پر ایک نظر، از مولانا مسعود عالم ندوی ص ۵

اس کتاب میں بھی مولانا نے جذبات محبت و عقیدت کو ایک طرف رکھتے ہوئے سیّد صاحب کی تحریک کی کوتاہیوں اور غلطیوں کا ذکر کیا ہے، حتیٰ کہ آٹھویں باب کا عنوان ہی ''ظاہری ناکامی کے اسباب'' رکھا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ تنقید و تنقیح میں وہ ذاتی تعلق و محبت کو زیادہ دخل نہیں دیتے تھے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ محبت بھرا جذبہ بھی رکھتے تھے۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں:

''مسعود صاحب جن کو ان کے صدہا قارئین اور بیسیوں واقفین ایک بے لاگ ناقد اور ایک خشک مصنف کی حیثیت سے جانتے تھے۔ ''محبت سے بھرا ہوا دل رکھتے تھے، ان کی مثال ایک پہاڑی چشمہ کی سی تھی۔ جو بہت دور تک پتھر کی سلوں کے نیچے بہتا ہے، لیکن پتھر کو ہٹایئے تو ابل پڑتا ہے۔''(۱)

تنقید کے سلسلے میں مولانا مسعود عالم ندوی لکھتے ہیں:

''پچھلے چند برسوں میں جن صاحبوں نے سیّد شہید اور ان کے ماننے والوں پر جو کچھ لکھا ہے۔ ان میں مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم و مغفور (ف ۱۳۶۳ھ) اور مولانا ابوالحسن علی ندوی قابل ذکر ہیں۔ مولوی طفیل احمد صاحب مصنف (مسلمانوں کا روشن مستقبل) نے بھی بہت کچھ لکھا ہے، مگر ان کا زیادہ تر اعتماد مجاہدین ہند کے خاص کرم فرما ڈاکٹر ولیم ولسن ہنٹر پر رہا ہے۔ مولانا سندھی کی کتاب ''شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک'' وسیع مطالعہ اور عمیق فکر کا نتیجہ ہے۔ مگر (اللہ ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور ان کی لغزشوں سے در گزر فرمائے) انہوں نے حزب ولی اللہ کی تشکیل اور من مانی توجیہ کی خاطر سیّد صاحب کے ماننے والوں اور خاص کر اہل صادق پور پر بڑا ظلم کیا ہے، اور ان کی

(۱) پرانے چراغ۔ از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ص: ۲۵۰

کمزوریوں کی تنقید و مذمت میں ان کا قلم اعتدال پر قائم نہیں رہ سکا ہے۔ راقم نے ان کی زندگی ہی میں اس کتاب پر تنقید کی تھی۔ اور اہل صادق پور کے صحیح حالات پیش کیے تھے۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی کی کتاب "سیرت سیّد احمد شہید" سیّد صاحب کی سوانح، ان کی تعلیمات اور مشن پر بے مثال کتاب ہے۔ اور اب تک اس موضوع پر جو کچھ لکھا گیا ہے، سب پر بھاری ہے، مگر افسوس! کہ میرے عزیزترین دوست اور مخلص بھائی کا طریق فکر و نظر خاص عقیدت مندانہ ہے اور انہوں نے بزرگوں کی کوتاہیوں اور فرو گزاشتوں سے نگاہ بچا کر نکل جانے کی کوشش کی ہے۔ راقم کی روش ان دونوں اصحاب علم و فضل کے مقابلے میں بین بین کی سی رہی ہے۔ یہ گنہگار سیّد صاحب کی تحریک تجدید و جہاد کو ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک سمجھتا ہے اور مولانا سندھی کی طرح ان کی دعوت کو کسی اندرونی یا بیرونی تحریک کا ضمیمہ نہیں خیال کرتا، اور نہ انہیں کوئی امیر جماعت، لفٹننٹ یا کمانڈر انچیف تصور کرتا ہے، دوسری طرف جیسا کہ زیر نظر صفحات کے مطالعے سے واضح ہوگا، سیّد صاحب یا ان کے اصحاب خاص کو معصوم بھی نہیں سمجھتا۔ نیز مستقبل میں ماضی کی غلطیوں سے بچنے کے لیے پچھلی فروگزاشتوں کی نشاندہی ضروری خیال کرتا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ طریق فکر بہت کم لوگوں کو خوش کر سکے گا، اور بہت ممکن ہے کہ اس کی مخالفت میں آوازیں بھی بلند ہوں، ان خطرات کو محسوس کرتے ہوئے بھی اس گنہگار نے جا بجا جائز اور بے لاگ تنقید

کرنے کی جرأت کی ہے اور یہ صرف اس خیال کے ماتحت کہ حق بات کڑوی معلوم ہوتی ہے، اور اگر کوئی پائیدار لٹریچر اور صالح فضا تیار کرنا ہے تو پھر پسند عام کی خاطر حق کے اظہار میں تامل نہ ہونا چاہیے۔ نیتوں کا حال اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔"(۱)

اس سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا کسی بڑے سے بڑے ولی اللہ کو بھی تنقید سے بالاتر نہیں سمجھتے تھے اور عقیدت مندانہ نظریے سے کسی شخصیت پر لکھنے کے قائل بھی نہ تھے، بلکہ بے لاگ تنقید کو کسی بھی شخصیت پر لکھنے کے لیے ایک اہم عنصر سمجھتے تھے، اسی لیے کتاب کے شروع میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

"اہل علم و ارباب نظر حضرات سے درخواست ہے کہ وہ حقیر کی کوتاہیوں اور لغزشوں پر متنبہ کرنے میں مطلق تامل نہ فرمائیں، یہ راقم اپنی طالب علمانہ حیثیت اور کم علمی سے خوب واقف ہے۔ ہر مفید مشورہ شکریہ کے ساتھ قبول کیا جائے گا اور تو اور معاندانہ تنقیدوں سے بھی کام کی بات مل سکی، تو اظہار اطمینان کے ساتھ اخذ کی جائے گی۔"(۲)

اس کتاب میں مولانا نے آٹھ باب قائم کیے ہیں، اور ہر باب علمی و تاریخی حقائق سے پر ہے۔

پہلا باب "وہابیت کیا ہے؟" کے عنوان سے قائم کیا ہے۔ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ وہابیت کس کو کہتے ہیں، اور یہ نسبت شیخ الاسلام کی طرف کیوں کی جاتی ہے۔ پھر مختصراً شیخ کے ابتدائی حالات، تاریخ پیدائش وغیرہ کا ذکر ہے، یہ باب اگرچہ مختصر ہے لیکن جامع ہے۔

دوسرے باب میں ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک اور نجد کی اسلامی تحریک اور

(۱) ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک۔ از مسعود عالم ندوی ص:۹

(۲) ایضاً ص:۹

دعوت توحید واصلاح کا فرق واضح کیا گیا ہے۔

تیسرے باب میں جہاد فی سبیل اللہ اور دعوت ومشن کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔

چوتھے باب میں سید احمد شہید کے بعد کے حالات کا ذکر تفصیلاً آیا ہے۔

پانچویں باب میں صرف تین عنوان قائم کیے ہیں۔

ہندوستان کے اندر۔

نظام عمل

فرہنگ مصطلحات

چھٹے باب میں سازش کے مقدموں کی روداد بیان کی ہے۔ یہ مقدمے حکومت نے مجاہدین کے خلاف ۱۸۶۴ء سے ۱۸۷۱ء تک ملک کے مختلف حصوں میں دائر کیے تھے، اس باب میں ان ہی مقدمات کا اجمالی ذکر آیا ہے۔

ساتویں باب میں صرف ایک عنوان ہے۔

اسیران بلا کے مصائب اور ان کی استقامت۔

آٹھویں باب میں صرف دو عنوان ہیں

ظاہری ناکامی کے اسباب

کامیابی یا ناکامی

کتاب کے آخر میں کتابیات کا ذکر ہے۔ اس میں اردو، فارسی انگریزی سب ہی کتابیں شامل ہیں۔

●●

نظرة اجمالية فی تاریخ الدعوة الاسلامیة فی الھند و باکستان

یہ مولانا کی اپنی تصنیف "تاریخ الدعوة الاسلامية فی الهند و باكستان" کا خلاصہ ہے جسے انہوں نے خود لکھا۔ پہلے اس کا نام غربة الاسلام فی الهند رکھا تھا۔ چنانچہ علامہ سیّد سلیمان ندوی انہیں ایک خط میں لکھتے ہیں:

> "آپ جو غربة الاسلام فی الهند" لکھنا چاہتے ہیں وہ بے سود کام ہے ایسی غربت تو کہاں کی نہیں لکھی جاسکتی ہے۔ شام و عراق و مصر بلکہ حجاز تک کی لکھی جاسکتی ہے۔"(۱)

اس خط کے حاشیے میں مولانا مسعود عالم ندوی لکھتے ہیں:

> "راقم کی زیر ترتیب عربی کتاب (غربة الاسلام فی الهند) جو بعد میں (تاریخ الدعوة الاسلامية فی الهند) کے نام سے مکمل ہوئی اس کا مختصر خلاصہ "نظرة اجمالية فی تاريخ الدعوة الاسلامية فی الهند و باكستان" کے نام سے چھپ کر شائع ہو چکا ہے۔"(۲)

اصل کتاب شاید ابھی تک زیور طبع سے آراستہ نہیں ہو سکی ہے صرف یہی خلاصہ جو درمیانی سائز کے ۱۶۰ صفحات پر مشتمل ہے اس وقت میسر ہے۔ البتہ اصل کتاب کا زیادہ تر حصہ مصر کے مشہور مجلّہ الفتح میں قسط وار "حاضر مسلمی الهند و غابرهم" کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ اور بقول مولانا امین احسن اصلاحی اس کا اردو ترجمہ "ہندوستان میں دعوت اسلامی کی تاریخ" کے نام سے شائع ہو چکا ہے لیکن نایاب ہے۔(۳)

اس کتاب میں سب سے پہلے "مقدمة النشر" کے نام سے مولانا مسعود عالم ندوی کا

---

(۱) مکاتیب سلیمانی، مرتب مسعود عالم ندوی ص ۱۹۰

(۲) ایضاً ص: ۱۸۹

(۳) چراغ راہ، مسعود عالم ندوی نمبر ۱۹۵۵ء ص ۱۸۶

تعارف ہے جسے الفتح کے ایڈیٹر محبّ الدین الخطیب نے لکھا ہے۔ کتاب کے آغاز میں ان وسائل اور کوششوں کا ذکر ہے جن کے ذریعہ ہندوستان میں اسلام کی اشاعت ہوئی۔ عرب تجار اور محمد بن قاسم ثقفی کا ذکر اس ضمن میں خاص طور سے کیا گیا ہے۔ بعد میں شیخ احمد سرہندی ملقب مجدد الف ثانی (۹۷۱ھ تا ۱۰۳۴ھ) کا تفصیلی ذکر ہے اور ان حالات کا ذکر کیا گیا ہے جن میں مجدد الف ثانی نہ صرف شجرۂ اسلام کی آبیاری کی بلکہ علمِ اسلامی کو سرنگوں نہیں ہونے دیا اور اسے بلند رکھا۔

اس کے بعد شیخ عبدالحق دہلوی (۹۵۸ھ تا ۱۰۵۲ھ) اورنگ زیب (۱۰۶۸ھ تا ۱۱۱۸ھ) شاہ ولی اللہ دہلوی (۱۱۱۴ھ تا ۱۱۷۶ھ) اور ان کے شاگردوں کی کوششوں اور اسلام کے لیے ان کی خدمات کا ذکر ہے۔ سیّد احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔ اس کے بعد سر سیّد احمد خاں کی تعلیمی کوششوں کا ذکر کیا اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے کردار اور اس کے قیام کے اسباب کو بیان کیا ہے۔ دارالعلوم دیوبند اور ندوۃ العلماء کا مختصر تعارف بھی کرایا ہے۔ علامہ اقبال، ابوالکلام آزاد اور مولانا محمد علی جوہر کے کارناموں کو بیان کیا ہے۔ بالخصوص علامہ اقبال کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔ "دعوة اسلامية خالصة" کے عنوان سے جماعت اسلامی کا تعارف بھی تفصیل سے کرایا ہے۔ ابتداء ترجمان القرآن (جاری کردہ ۱۹۳۳ء) سے کرتے ہیں۔ جماعت کی تاسیس کے اسباب پر بھی روشنی ڈالی ہے اور اس میں شمولیت کے طریقوں کی وضاحت کی ہے۔ دستور اور لٹریچر کا تعارف کرایا ہے اور اس ضمن میں دارالعروبة کا ذکر بھی آیا ہے۔ کتاب مختصر ہونے کے باوجود بہت جامع ہے۔

دیار عرب میں چند ماہ

یہ کتاب مولانا کے عراق و حجاز کے سفر کا روزنامچہ ہے۔ یہ سفر تقریباً ساڑھے سات مہینے کا رہا۔ اس دوران مولانا نے عراق کے مختلف شہروں، کویت اور نجد کے علاوہ ریاض کی بھی سیاحت کی، آخر میں بیت اللہ جا کر حج وزیارت کی سعادت بھی حاصل کی۔ مولانا مسعود عالم ندوی خود اس روزنامچے کے بارے میں لکھتے ہیں:

"یہ روزنامچہ شروع شروع میں وقت گزاری کے طور پر لکھتا رہا، مہینہ دو مہینہ بعد طباعت و اشاعت کا خیال پیدا ہوا، تجربے کے طور پر دو تین قسطیں "کوثر" میں چھپوائیں، دوستوں اور رفیقوں نے حوصلہ افزائی کے بیسیوں خطوط لکھے، بعضوں نے سیاسی مسئلوں پر بھی بحث و گفتگو کی فرمائش کی، حوصلہ افزائیوں نے ہمت بندھائی، اور یہ سلسلہ جاری رہا۔

اپنی کوشش یہی رہی ہے کہ سادگی اور بے ساختہ پن میں فرق نہ آنے پائے، یہ روزنامچے ایک خاص نقطہ نظر سے لکھے گئے ہیں، خاکسار تاریخ کا طالب علم ہے، مگر ان یادداشتوں میں تاریخ نگاری کی شان نہیں نظر آئے گی۔ اس سفر کا بڑا مقصد ہم مذاق اور ہم مشرب دردمند رفیقوں کی تلاش تھی۔ آثار قدیمہ اور مشہور مقامات کی زیارت کا موقع بھی بہت کم ملا، حرمین کے علاوہ دوسری جگہوں کی طرف تو توجہ بھی نہ کر سکا، ان کے بدلے دردمند نوجوانوں اور ہم مشرب اہل علم و اہل قلم سے ملنے ملانے میں زیادہ وقت صرف ہوا۔ اس کتاب میں آپ کو یہی چیز نظر آئے گی۔"(۱)

---

(۱) دیار عرب میں چند ماہ ص ۵

مولانا مسعود عالم ندوی کا یہ روزنامچہ پر از معلومات ہے، جس جس راستے سے گزرتے ہیں، وہاں کے سیاسی، سماجی اور اقتصادی حالات پر بھی اس روزنامچہ میں گفتگو کرتے ہیں، آثار قدیمہ اور مشہور مقامات کی تاریخی حیثیت بھی بیان کرتے ہیں۔ مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی مدّظلہ العالی لکھتے ہیں:

> "عراق و حجاز کا یہ سفر بڑے بلند عزائم اور مقاصد کے ساتھ تھا اب وہ اپنی کتابوں اور ادبی شہرت کی بناء پر علمی و دینی حلقوں میں روشناس اور ایک دعوت و تحریک (جماعت اسلامی) کے نقیب و ترجمان سمجھتے جاتے تھے، قدیم آرزو کی تکمیل کا سامان بھی موجود تھا، ان کے محبوب استاد شیخ تقی الدین ہلالی بغداد میں موجود تھے، جو اب ان کے تلمذ پر فخر کرتے تھے، اور حلقۂ احباب میں شمار کرنے پر تیار تھے، ۲۸/اپریل ۴۹ء سے ۱۳/ دسمبر ۴۹ء تک یہ سفر ممتد رہا، جس کی مفصل روداد اور روزنامچہ "دیار عرب میں چند ماہ" میں محفوظ ہے، اور وہ ان کی جد و جہد و انہماک، جذبۂ دعوت اور ان کی ذہنی و علمی صلاحیتوں کی ناطق شہادت ہے، اس کتاب میں وہ بولتے ہوئے نظر آتے ہیں اور ان کے ذہن و مزاج کی پوری تصویر آگئی ہے۔ وہی صاف گوئی، وہی تلخ نوائی، کہیں تنقید کی تلخی، کہیں محبت کی شیرینی، اکثر و بیشتر عقل کی پاسبانی، لیکن کبھی کبھی اقبال علیہ الرحمۃ کے اس مشورے پر عمل کہ ؎
>
> لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑدے۔" (۱)

مولانا مسعود عالم ندوی کے اس سفر کے دو اہم مقصد تھے:

ایک تو یہ کہ اپنے استاد شیخ تقی الدین الہلالی سے استفادہ کرنا تھا، عربی زبان و ادب میں

---

(۱) پرانے چراغ، مصنف مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی ص ۳۴۷

ہلالی صاحب کی صلاحیت مسلم تھی، اور وہ بھی مسعود صاحب کی شاگردی پر فخر کرتے تھے۔

مولانا کے خاص رفیق محمد عاصم صاحب لکھتے ہیں:

"بغداد میں ہم لوگ ہر روز ہلالی صاحب کے ہاں جاتے، انہیں اپنے عربی رسالے پڑھ کر سناتے جس سے ہمارے رسالوں کی تصحیح بھی ہوتی علمی فائدہ بھی پہنچتا اور ہلالی صاحب بھی دعوت سے متعارف ہوتے۔"(۱)

دوسرا اہم مقصد اس سفر کا جماعت اسلامی کی دعوت اور اس کے پیغام کو عربوں تک پہنچانا تھا، اور اپنے پورے سفر کے دوران مولانا نے جماعت اسلامی کی دعوت کو ہر طبقہ تک پہنچانے کی بھرپور کوشش کی۔ محمد عاصم صاحب لکھتے ہیں:

"دو ڈھائی سال کی کوششوں کے بعد اندازہ ہوا کہ جب تک عرب ممالک کا دورہ نہ کیا جائے، یہاں رہتے ہوئے ان ممالک میں کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ عربی رسالے کئی کئی ہزار کی تعداد میں چھپ گئے تھے مگر باہر کہیں نہیں جا رہے تھے۔ لہٰذا مسعود صاحب نے عزم کیا کہ عرب ممالک کا ایک دورہ کیا جائے۔"(۲)

ممالک عربیہ میں مسعود عالم ندوی نے جس محنت اور لگن کے ساتھ جماعت اسلامی کے پیغام کو لوگوں تک پہنچایا ہے، وہ ایک اہم کارنامہ ہے، اور یہ ایک حقیقت ہے کہ ان سے زیادہ پورے ہند و پاک میں اس کام کے لیے کوئی دوسرا شخص موزوں نہ تھا۔ اس سلسلے میں مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں:

"مسعود صاحب کی جماعت اسلامی سے وابستگی جماعت کی بڑی خوش نصیبی تھی، وہ ہندوستان میں عربی کے سب سے بڑے انشاء پرداز اور

---

(۱) ماہنامہ چراغ راہ، کراچی، مسعود عالم ندوی نمبر (۱۹۵۵ء) ص:۱۳۶

(۲) ایضاً ص ۱۳۶

کہنہ مشق صحافی ہیں، الضیاء مرحوم، ادباء مصر و شام سے صحت زبان اور فصاحت کی سند لے چکا ہے۔
امین ناصر الدین لبنانی اور انستاس کرملی بغدادی جو اپنی لغوی تحقیق و احتیاط میں خاص طور پر مشہور تھے، الضیاء کی زبان کی پختگی اور بلندی کا اعتراف کر چکے ہیں۔ شیخ تقی الدین الہلالی جو زبان و قواعد میں مرجع کی حیثیت رکھتے ہیں، مسعود صاحب کو مصر کے بہت سے اخبار نویسوں پر ترجیح دیتے تھے، جماعت اسلامی کے پاس اردو کے بڑے اچھے نثار، طنز نگار اور افسانہ نویس تھے، لیکن کوئی ایسا عربی کا ادیب اور صاحب قلم نہ تھا جو اس کی دعوت کو ممالک عربیہ میں پہنچانے کی صلاحیت رکھتا، مسعود صاحب کی ذات میں اس کو عربی میں دعوت کا ایک کامیاب ترجمان اور ممالک عربیہ کے لیے ایک فاضل سفیر مل گیا۔"(۱)

اسی مقصد یعنی تحریک اسلامی کے تعارف اور اس کے پیغام کو عربوں تک پہنچانے کے لیے مسعود عالم ندوی صاحب نے عراق، نجد، حجاز اور دوسرے ملکوں کا سفر کیا، اور ایک مدت تک قیام کر کے اسلامی دعوت و تبلیغ کے امکانات و مواقع، مختلف طبقات کی صلاحیتوں اور دعوت کی ضرورتوں کا مطالعہ کیا، اور پھر اس مطالعے کا نچوڑ اس کتاب میں پیش کیا ہے۔

لوگ عموماً سفر سے واپس آ کر گھر میں بیٹھ کر اپنے سفر نامے مرتب کرتے ہیں اور دوران سفر جو نکات انہوں نے لکھ لیے ہوتے ہیں، ان ہی کو سامنے رکھ کر سفر نامے ترتیب دیتے ہیں، لیکن اس طرح کے سفر ناموں میں صرف اہم واقعات و تاثرات قلم بند ہو پاتے ہیں۔ ان میں ان ملکوں کی روز مرہ زندگی کی جھلک، وہاں کی معاشرت کی بے تکلف تصویر اور مسافر کے بے ساختہ تاثرات نہیں آنے پاتے، لیکن مسعود صاحب ہر روز شام کو اپنا روزنامچہ

---

(۱) ماہنامہ الفرقان، لکھنؤ، ایڈیٹر: مولانا منظور نعمانی صاحب۔ ماہ ذی الحجہ ۱۳۶۹ھ ص: ۴۱

لکھتے تھے، جس کی وجہ سے تمام واقعات کا احاطہ ہو گیا ہے۔ اس سلسلے میں مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں:

"مسعود صاحب کا یہ روزنامچہ "دیار عرب میں چند ماہ" کے نام سے باریک حروف ۲۰×۳۰/۱۶ سائز کے ۳۹۰ صفحات پر شائع ہوا ہے، کتاب اول سے آخر تک نہایت دل چسپ شگفتہ، بے تکلف انداز میں لکھی گئی ہے۔ کہیں کہیں روزنامچے کے عام انداز بیاں سے زیادہ ادبیت پیدا ہو گئی ہے، جو مصنف کا مخصوص طرز ہے اور ان کی تمام تصنیفات کی خصوصیت۔

کتاب کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ نہایت پر از معلومات ہے، اور حشو و زائد سے بالکل پاک، نہ بغداد کی تاریخ ہے، نہ "رہنمائے مسافراں" قسم کی کوئی کتاب، نہ اپنی شان میں قصیدہ گوئی۔ اول سے آخر تک ایک ایسے داعی کے سفر کی روداد ہے جو چشم بینا، گوش شنوا، اور قلب بیدار رکھتا ہے۔ دن بھر جو دیکھتا ہے، جو کچھ سنتا ہے اور جو کچھ محسوس کرتا ہے، سونے سے پہلے کاغذ کے حوالے کر دیتا ہے۔ کتاب میں جا بجا ایسے حصے ہیں، جو قلب کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتے، عالم اسلامی بالخصوص ممالک عربیہ کی زبوں حالی ایک حساس درد مند مسلمان کو ضرور متاثر کرتی ہے۔ مکہ معظمہ اور مدینہ طیبہ کی حاضری کے موقع پر مصنف بے اختیار ہو جاتا ہے، اور اس کا ایمان اور قلبی احساس اس کے قلم اور انداز تحریر کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتا۔"(۱)

اور یہ حقیقت ہے کہ مسعود صاحب کا انداز تحریر متاثر کیے بغیر نہیں رہتا۔ عربوں کی زبوں حالی کا ذکر کرتے ہوئے کیا خوب لکھتے ہیں:

---

(۱) ماہنامہ الفرقان، لکھنؤ۔ ایڈیٹر مولانا محمد منظور نعمانی۔ ذی الحجہ ۱۳۶۹ھ ص: ۴۶

”ریاض اور کویت کی درمیانی منزلوں کی طرح یہاں بھی بدوؤں کے لڑکے روٹی کے ٹکڑوں کی تلاش میں ہر طرف ہاتھ پھیلائے نظر آتے ہیں۔

اللہ اللہ جن کے آبا واجداد نے اونٹ کا دودھ پیتے پیتے ایک امّی کے طفیل کسریٰ و قیصر کی حکومتوں کی اینٹ سے اینٹ بجا کر رکھ دی، آج وہ پھر اسی جہالت اور فقر و بیکسی کی زندگی گزار رہے ہیں، عربوں نے اللہ کے دین کو چھوڑا، تو اللہ کی نعمتوں نے بھی ان سے منہ پھیر لیا، اور اس سے زیادہ بدنصیبی کا مقام یہ ہے کہ جن خوش بختوں کو اللہ کی رحمت سنبھلنے کا بار بار موقع دے رہی ہے، وہ اسراف و تبذیر میں بری طرح پھنسے ہیں، انہیں اپنی مفلوک الحال اور جاہل رعایا کی مطلق فکر نہیں۔

ہائے عجیب دردناک منظر تھا عاجز نے ایک بچے کو بلا کر تمام سوکھی روٹیاں دے دیں۔ بس پھر کیا تھا، دو تین منٹ کے اندر ہمارے جھونپڑے پر دس بارہ بچوں نے مل کر حملہ کر دیا، اور طرح طرح کی دعائیں دے کر۔ گڑگڑا کر روٹی کا ایک ٹکڑا مانگنے لگے۔ لاکھ کہوں، بابا اب ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔ مگر وہ نہیں مانتے۔ بدقسمتی سے ہمارے پاس چھوٹے سکے بھی نہ تھے ورنہ ایک ریال میں سب کو منا کر رخصت کر دیتا۔ ایک ریال میں ۲۲ر قرش ہوتے ہیں۔ ہمارے پاس صرف ریال تھے۔ ہر ایک کو ایک ایک ریال دینا بھی ہماری حیثیت سے باہر تھا۔ بڑا پریشان ہوا۔ عربوں کا عاشق، عربی عظمت کا خواب دیکھنے والا، عربی نخوت و حمیت کا نغمہ سنج، یہ گنہگار ایک عجیب کیفیت سے دوچار تھا۔ بڑی مشکل سے جان چھوٹی۔ جان تو چھوٹی مگر دل پر ایک داغ رہ گیا۔

شاہی خاندان کے افراد ایک ایک ڈنر پر دس دس ہزار پونڈ صرف کریں۔ اور وسط صحرا میں بدوؤں کے بچے روٹی کے ایک ٹکڑے کو ترسیں۔ اگر اسلامی حکومت اسی کا نام ہے تو پھر اسلام اور مسلمانوں پر فاتحہ پڑھ لینا چاہیے۔"(۱)

مکہ معظّمہ اور مدینہ طیّبہ کی حاضری کے موقع پر مسعود صاحب بے اختیار ہو جاتے ہیں۔ جس کا اندازہ ان کے قلم اور انداز تحریر سے بخوبی ہوتا ہے، اور جس دن مدینہ منورہ کی حاضری کا شرف حاصل ہوا اس دن کا روزنامچہ ایمان کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتا۔ اس دن مسعود عالم صاحب بے حال ہو جاتے ہیں۔ عجیب کیفیت ہوتی ہے۔ یہاں اس دن کا پورا روزنامچہ نقل کیا جاتا ہے، تاکہ معلوم ہو سکے کہ عربوں کا عاشق عربی عظمت کا نغمہ خواں جب مدینہ طیبہ کی حاضری کا شرف حاصل کرتا ہے، تو اس کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔

جمعرات ۵/محرم ۶۹ھ ۲۷/اکتوبر ۴۹ء مدینہ منورہ۔

صبح ہوئی، قافلہ روانہ ہوا، اور مدینہ منورہ کی قربت طبیعت کو اکسانے لگی، ابھی تین چار گھنٹے کی مسافت باقی ہے، لیکن دل ابھی سے لرزنے لگا، مدّتیں گزریں، زمانہ بیت گیا، مدینہ کی حاضری کا شوق دل میں چٹکیاں لیتا رہا، بارہا فرط شوق میں آسی غازی پوری کا یہ پر کیف مطلع پڑھتا رہا ہوں ؎

صبا تو جا کے یہ کہیو میرے سلام کے بعد
کہ تیرے نام کی رٹ ہے خدا کے نام کے بعد

وہ کیا ساعت ہوگی، جب یہ گنہگار روبرو حضرت عالی میں سلام عرض کرے گا، جب کبھی یہ خیال آتا، آنکھیں پرنم ہو جاتیں، درود پڑھتا، اور عربی اردو کے مناسب حال شعر زبان پر جاری ہو جاتے، کچھ دیر

---

(۱) دیار عرب میں چند ماہ۔ از مولانا مسعود عالم ندوی ص: ۲۲۷

کے لیے مُسیجید کے اسٹیشن پر موٹر رکی، راستے میں جابجا اسٹیشن ہیں، اور موٹروں کے لیے پٹرول کا ذخیرہ بھی وہاں رہتا ہے، یہ بھی انہیں میں سے ایک ہے، ہم موٹر سے اتر پڑے، اور کچھ دیر چہل قدمی کی قریب ہی ایک مدرسے کی عمارت نظر آئی، پر اتنا وقت نہیں تھا کہ اندر جا کر دیکھتا۔ مُسیجید سے بھی قافلہ آگے کو روانہ ہوا۔ اب یہ گنہگار ہمہ تن شوق ہے، وہابیت کی خشکی کے باوجود دل پسیج رہا ہے، جانے ان راستوں سے حضور انور ﷺ کا بھی گزر ہوا ہو۔ موٹر نہ ہوتی تو گرد راہ سے پوچھتا، شاید نقش پا کے کھوئے ہوئے اثرات کا سراغ لگتا، شاعر کی زبان میں محبوب کے گزرنے سے تمام وادی نعمان معطر ہو گئی تھی۔

تضـوع مسـکا بطـن نعمـان اذ مشـت
بهـا زینـب فـی نسـوة عطـرات

تو کیا سرور عالم (علیه الصلوٰة والتسلیم) کی گزرگاہ میں ہوائیں مشک آفریں اور عنبر بیز پسینے کی خوشبو سے خالی ہوں گی؟

مدینہ کی پاک سرزمین قریب ہوتی جا رہی ہے، اور خاکسار کھانسی کے حملوں سے چور، کھویا ہوا، گنگناتا اور درود پڑھتا چلا جا رہا ہے، موٹر میں تیس بتیس مسافروں میں سب کے سب حج سے فارغ ہو کر مدینۃ الرسول کی زیارت کو جا رہے تھے، لیکن کہیں گداز و شوق کا نام نہیں، وہی باتیں وہی خوش گپیاں، دل ہی دل میں کڑھتا، مگر کرتا کیا؟ اپنے دل کا جائزہ لیتا، وہ بھی پتھر نظر آتا، رسول کریم ﷺ سے محبت کے دعوے خالی خولی معلوم ہوتے ہیں، اپنے متعلق تو رائے زنی کی جا سکتی ہے، دوسروں کے ساتھ کیوں بدگمانی سے کام لیا

جائے؟

اتنے میں شور ہوا کہ ذوالحلیفہ جسے "آبار علی" بھی کہتے ہیں۔ آ گیا، سن کر دل بلیوں اچھلنے لگا۔ یہ اہل مدینہ کی میقات ہے، یہاں سے مدینہ چار پانچ میل سے زیادہ نہیں۔ رسول اللہ ﷺ اور ان کے جاں نثار صحابیوں نے یہیں سے حج کا احرام باندھا ہوگا۔ جی چاہا کہ غسل کر کے کپڑے بدل لیے جائیں، اور یہاں سے پیدل چلیں، مگر کھانسی اور اس پر حرارت، نیز کمزوری حد سے بڑھی ہوئی ہمت نہ پڑی، عرصے سے تمنا تھی کہ مدینہ پاپیادہ داخل ہوں، امام مالکؒ مدینہ منورہ میں سواری استعمال نہیں کرتے تھے، کہتے جہاں رسول کریم ﷺ کی قبر ہے، اس زمین کو کسی جانور کی ٹاپوں سے روندنا حرام سمجھتا ہوں عربی کا ایک دل آویز شعر بڑے ذوق و شوق سے پڑھا کرتا تھا ؎

و اذا بلغن بنا المطی محمدا
فظھورھن علی الرجال حرام

مگر جب اس تمنا کے پورا کرنے کا وقت آیا، تو مرض نے بے بس کر دیا، وائے ناکامی! عاصم صاحب سے رائے طلب کی، صرف کپڑے ہی بدل لیے جائیں، گرد و غبار کی وجہ سے ان کی رائے نہ ہوئی، آخر صبر کر کے بیٹھ رہا، لیکن دل کے اندر سے ایک آواز آ رہی تھی ؎

نگاہیں فرش راہ ہوں حمید سر کے بل چلو
ادب، ادب، یہ کوچہ حبیب کردگار ہے

مگر سنے کون؟ مسعود بے نوا تو کھانسی سے چور قہوہ خانے میں بیٹھا ہوا

اپنے ساتھیوں کو امید بھری نظروں سے دیکھ رہا ہے، ایک قہوہ خانے میں چائے پی، اور پہلی بار مدینہ کے انگور کھائے، انگور اچھے اور لذیذ تھے شوق محبت نے انہیں اور لذیذ بنا دیا، عجیب سوء اتفاق کہ اس بدبخت قافلے میں کسی نے غسل کیا نہ کپڑے بدلے، نہ پیدل ہی چلنے کی ہمت کی۔

ذوالحلیفہ سے قافلہ آگے بڑھا، ڈرائیور نے کچھ دیر کے بعد پکارا! وہ دیکھو، نگاہیں اٹھ گئیں، اور دیدہ پرنم نے دھندلی عمارتوں کو سلام کیا، جوں جوں منزل قریب ہوتی گئی، تحیر اور ہول کی حالت طاری ہونا شروع ہوئی۔

درود و سلام کے علاوہ ابن جبیر اندلسی کے مشہور قصیدے کے اشعار ورد زبان تھے، اپنی طول وطویل سیاحت کے بعد جب وہ مدینے سے قریب ہوا ہے تو اسکی درد بھری طبیعت گدگدائی اور زبان قلم نے ایک پرکیف قصیدہ لکھا، مطلع یہ ہے ؎

اقول و آنست بالليل نارا

لعل سراج الهدیٰ قد انارا

ترجمہ "قافلہ چلتے چلتے جب میں نے رات کو آگ دیکھی، تو بول اٹھا، شاید یہ شمع ہدایت کی روشنی ہے" یہ قصیدہ شاعری کے محاسن کے علاوہ دردو سوز سے بھرا ہوا ہے۔ اس کے چند شعر عرصے سے ورد زبان رہا کرتے تھے، اس موقع پر ان سے لطف اندوز ہوتا رہا۔

ذوالحلیفہ سے بڑھے تو بئر عروۃ ملا، یہ مدینے کا مشہور کنواں ہے، اور اس کا پانی بہت شیریں اور صحت بخش ہے۔ ہارون الرشید کے لیے

اس کا پانی تحفے کے طور پر جایا کرتا تھا، یہ مدینے سے کوئی دو میل کے فاصلے پر ہے۔ اکثر اصحاب شوق اور عشاق رسول یہاں سے پیدل ہو جاتے ہیں مگر ہمارے قافلے میں ایک بھی مرد عاشق نہ نکلا۔ زیادہ سے زیادہ جو ہمارے ساتھیوں نے کیا، وہ مدینہ کی عمارتوں پر نظر پڑتے ہی درود اور فاتحہ کا اعلان تھا، آخر مدینہ کی چار دیواریوں میں داخل ہوئے۔ باب العنبر پر یہ موٹر رکی، ٹکٹ وغیرہ کی جانچ پڑتال ہوئی۔ واپسی کے ٹکٹوں پر تاریخ دی گئی۔ ایک صاحب نے قیافے سے پہچان کر دریافت کیا "تم مسعود ندوی ہو" عرض کیا: جی ہاں! بولے۔ ابھی ابھی سیّد احمد محضار العطاس اور شرقی صاحب تمہاری راہ دیکھ کر گئے ہیں۔ شاید راستے ہی میں مل جائیں۔ شرقی صاحب اپنے پورے قافلے کے ساتھ اپنے دوست سیّد محضار کے ہاں ٹھہرے ہیں۔ اور راقم کو بھی مکہ مکرمہ ہی میں دعوت دی تھی، سیّد محضار ہندوستان جا چکے ہیں۔ جالندھر میں نیاز حاصل ہو چکا ہے۔ اس لیے دعوت قبول کر لی تھی، اور چلتے وقت تار بھی دے دیا تھا، تھوڑی دیر کے بعد موٹر اندرون شہر داخل ہوئی اور موٹروں کے اڈے پر آ کر رکی۔ حسن اتفاق سے سیّد محضار کے چھوٹے بھائی موجود تھے۔ بلا کسی جھجک کے ہم ان کے ساتھ ہو لیے۔ اور پانچ منٹ میں ان کے دولت کدے پر پہنچ گئے۔ فالحمد لله الذی بنعمته تتم الصالحات یہاں شرقی صاحب، اسرار محمد خاں صاحب (ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس) اور عظمت علی شاہ صاحب وغیرہ ملے۔ اللہ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ بیماری اور کمزوری کے باوجود اس نے مدینۃ الرسول پہنچا دیا۔ اب وہی ہے

جو یہاں کی برکتوں سے فیض یاب ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ و ماذالك على الله بعزيز ۔۔۔

پہلا مرحلہ مسجد نبوی میں حاضری کا تھا، شرقی صاحب نے گرم پانی کا انتظام کرایا، اور ہم لوگوں نے غسل کیا، کپڑے بدلے اور خوشبو لگائی، شرقی صاحب کی رہنمائی میں حرم پہنچے، دو منٹ کی بھی راہ نہیں ہوگی، دروازے پر پہنچے تو مکہ مکرمہ کی خشونت اور مسجد حرام کی سادگی کے برعکس ساری فضا لطیف اور مسجد عروس المساجد معلوم ہوئی۔ جدھر نگاہ اٹھے، خطاطی اور فن کاری کے بہترین نمونے نظر آئے۔ لیکن اس وقت خطاطی اور فن کاری پر نگاہ ڈالنے کی کسے فرصت! ایک مرعوبیت اور تاثر کے عالم میں روضہ یعنی منبر اور قبر اطہر کے درمیان تحیۃ المسجد ادا کی۔ ہجوم اور شور میں دل پر شوق کیا کہیے۔ نماز کے بعد شباک (۱) نبوی جسے عام طور پر مواجہہ شریفہ کہتے ہیں کے پاس مؤدبانہ قدم بڑھاتے ہوئے آئے۔ سلف کے معمول کے مطابق السلام علیک یا رسول اللہ سلام علیک ایھا النبی ورحمۃ اللہ وبرکاتہ اور درود پڑھ کر آگے بڑھا، اور شیخین کی قبروں کے سامنے السلام علیک یا ابا بکر خلیفۃ رسول اللہ اور السلام علیک یا ایھا الفاروق یا عمر بن الخطاب کہتا ہوا آگے بڑھ کر ایک طرف قبلہ رخ ہو کر کھڑا ہو گیا اور وقت اور موقع کے لحاظ سے حسب توفیق دعا کی۔ اس کے بعد شرقی صاحب کی رہنمائی میں مسجد کے دوسرے حصوں پر سرسری نظر ڈالتا ہوا قیام گاہ واپس آگیا، یہ

---

(۱) قبلہ شریف کا رخ مغرب اور مشرق ہے۔ یعنی سرہانہ مغرب اور پائے مبارک مشرق کی جانب ہیں۔ چہرہ انور قبلہ (جنوب) کی طرف ہے۔ وہیں چہرہ انور کے روبرو قبلہ کی طرف چھوٹا سا گول دائرہ کھول دیا گیا ہے، اور اسی کو عام طور پر مواجھہ کہا جاتا ہے۔ اسی طرح دائیں طرف کچھ ہٹ کر شیخین کے سامنے بھی گول دائرے کھول دیے گئے ہیں۔

منزل سب سے مشکل اور قدم میں لغزش ڈالنے والی تھی۔ ابن عمرؓ جب سفر سے آتے صرف السلام علیك یارسول اللہ، السلام علیك یا ابابکر اور السلام علیك یا ابت کہتے ہوئے آگے بڑھ جاتے۔ امام مالکؒ السلام علیك ایھا النبی و رحمۃ اللہ و برکاتہ کہنے پر اکتفا کرتے۔ لیکن بعد کے علماء اور صوفیوں نے لمبے لمبے سلام ایجاد کیے ہیں۔ پتہ نہیں یہ حضرات ابن عمرؓ اور امام مالکؒ سے بھی زیادہ عاشق رسول اور آداب محبت کے زیادہ ادا شناس ہیں؟ ہمارے بعض مخلص دوست وہاں خراج عقیدت ادا کرنا ضروری خیال کرتے ہیں۔ لیکن کیا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے احسانات اور فضائل و محامد دس پندرہ سطروں کے سلام سے ادا ہو سکتے ہیں۔ ہم تو سنت رسولؐ کے عاشق ہیں، اور جہاں سنت رسول نہ ہو وہاں صحابہ کی سنت ہمارے لیے مشعل راہ ہے۔ ظاہر ہے کہ حضور انور ﷺ کی قبر اطہر پر حاضر ہو کر کیا آداب برتے جائیں؟ اس بات میں اکابر صحابہ ہی کا طریقہ صحیح اور قابل اتباع کہا جا سکتا ہے، جو مخلص عالم شدت محبت کے باعث ان امور میں تساہل برتتے ہیں حقیقت میں وہ نادانستہ طور پر بدعات کا دروازہ کھولتے ہیں۔ بہر حال خاکسار نے ابن عمرؓ اور امام مالکؒ کے طریقے پر مختصر سلام پر اکتفا کیا، باقی وہاں جو شور و شغف ہوتا ہے، اور جاہل معلم دور اور نزدیک سے آنے والے جاہلوں کو جس طرح زور زور سے سلام پڑھواتے ہیں، وہ حد درجہ مذموم اور قابل نفرت ہے۔

صحابہ کرامؓ مسجد نبوی میں زور سے باتیں نہیں کرتے تھے کہ اس میں حبط عمل کا خطرہ ہے، حضرت عمرؓ نے اپنے عہد خلافت میں بعض صحابہ کو مسجد نبویؐ میں بلند آواز سے باتیں کرنے پر تنبیہ فرمائی تھی۔ مگر

یہاں سلام کے وقت وہ شور ہوتا ہے کہ الامان و الحفیظ ہمارے تو رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ اس قوم کا ہر جگہ ایک حال ہے، نہ مسجد حرام میں بیت اللہ اور حجر اسود کی حرمت کا خیال نہ مسجد نبوی میں رسول کریم (علیہ الصلوٰۃ والتسلیم) کے ساتھ آداب کا لحاظ، وہی بہتر جانتا ہے، شعائر کی یہ بے حرمتی کب تک ارحم الراحمین کے یہاں قابل عفو قرار دی جائے گی۔

واپسی پر کھانا کھایا، اور شام تک آرام کرتا رہا۔ نمازوں کے لیے حرم گیا، باقی اوقات کمرے ہی میں پڑا رہا۔ سردست دوسری منزل کے ایک کمرے میں ڈیرہ ڈال دیا گیا ہے، کل اوپر کی منزل میں ایک وسیع کمرہ خالی ہو جائے گا، اور شام تک ہم لوگ وہیں منتقل ہو جائیں گے۔ شرقی صاحب کے قافلے کی ایک بڑی تعداد کل رخصت ہو رہی ہے۔ کھانسی اور تھکان کے باوجود رات اچھی بسر ہوئی۔ اللہ کا ہزار ہزار شکر ہے۔"(۱)

یہ صرف ایک دن کا روزنامچہ ہے، جو اس قدر سادہ اور شگفتہ انداز بیان میں تحریر کیا ہے، اور اپنے قلبی تاثرات کو بالکل اسی رنگ میں پیش کیا ہے، جسے انہوں نے محسوس کیا ہے، کوئی بناوٹ اور تصنع کی جھلک دکھائی نہیں دیتی، اس سے آپ یہ بھی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ کتاب کس قدر معلومات سے بھری ہوئی اور قلب وایمان کو جھنجھوڑنے والی ہے، حقیقت میں یہ وہ کتاب ہے جس کے ذریعہ سے ہم مسعود عالم صاحب کی ہمہ گیر شخصیت کو پہچان سکتے ہیں۔ ان کے صحیح عقائد اور افکار کا اندازہ بخوبی لگا سکتے ہیں۔ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب لکھتے ہیں:

یہ وہ کتاب ہے کہ جس کے آئینے میں "مولانا مسعود عالم ندوی" اپنے پورے سراپا کے ساتھ نظر آتے ہیں، اپنی دوسری کتب میں وہ ایک مورخ ہیں، جو اگرچہ تحریک اسلامی کا ایک مفکر ہے، اور مقصد کو کسی حال میں نظر انداز نہیں کرتا لیکن فکر و تحقیق و تفتیش کا وزنی پردہ شخصیت کو

(۱) دیار عرب میں چند ماہ، از مسعود عالم ندوی ۔ص ۳۱۲

بہت دور پیچھے چھپائے رہتا ہے۔ اس کتاب میں مولانا مسعود عالم ندوی خود نظر آتے ہیں، بالکل ویسے ہی جیسے میں نے ان کو دیکھا۔ جیسے وہ باتیں کرتے تھے، جیسے وہ دعوت پیش کرتے تھے، جیسے ان کا لہجہ تھا، جیسی ان کی فکر تھی، جیسا ان کا انداز تھا۔ ہو بہو وہی۔ بالکل خود مولانا مسعود عالم ندوی۔۔۔ جو ان کی سیرت، کردار، شخصیت، سراپا اور صحبت قریب سے دیکھنا چاہے وہ ان کی کتاب "دیار عرب میں چند ماہ" غور و فکر سے پڑھے۔ اسے نظر آجائے گا کہ ایک روح اضطراب ہے، جو اپنے دوش پر ایک بیمار جسم کو لادے اللہ کے دین کی راہ میں صحراؤں میں، دریاؤں، اور آبادیوں میں ایک ہی دھن اور ایک ہی فکر میں سرگرداں ہے، وہ کراچی میں بیٹھے ہیں ٹ یا حجاز میں پہنچ گئے ہیں، وہ کویت و نجد اور ریاض جاتے ہیں، وہ شیخ امجد آباوی، علامہ ہلالی، طہٰ فیاض اور محمد محمود صواف سے گفتگو کرتے ہیں۔ ہر جگہ وہ مجسم دعوت اور مجسم دردو سوز بنے ہوئے نظر آتے ہیں۔ پھر وہ شخصیت جو راہ تحقیق میں بالکل چھپی ہوئی تھی، جب اللہ کی راہ میں سفر کرتی ہوئی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے دیار میں پہنچتی ہے، تو تحقیق و تفتیش کی مورخانہ خشکی اچانک آنسوؤں سے تر ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔"(۱)

اور یہ حقیقت یہ ہے کہ مولانا جب دیار رسول صلی اللہ علیہ وسلم پہنچتے ہیں تو ان کی حالت عجیب ہوتی ہے، والہانہ محبت اور عاشقانہ کیفیت کا بھرپور اظہار ہوتا ہے، اس وقت ان کی کیفیت قابل رشک معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ طائف سے گزرنے کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

"طائف کی سڑکوں اور بازاروں سے گزرے، لاریاں اور ٹرک بھر بھر

(۱) چراغ راہ، کراچی۔ مسعود عالم ندوی نمبر ۱۹۵۵ء ص: ۱۹

کر حجاج کو لے جا رہے تھے، نگاہیں شہر کی عمارتوں پر تھیں، لیکن دل جذبات شوق سے معمور، ایک ایک پتھر اور ایک ایک اینٹ کو شوق اور تجسّس کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔ کیا یہ وہی طائف ہے جس نے حضور انور ﷺ کی دعوت ٹھکرا دی تھی؟ کیا یہ وہی پہاڑیاں اور دشوار گزار گھاٹیاں ہیں جہاں حضرت ﷺ کے قدم مبارک لہو لہان ہوئے تھے۔ موٹر دو متوازی پہاڑی سلسلوں اور پر پیچ گھاٹیوں سے ہو کر جا رہی تھی اور گنہگار بار بار دل میں کہتا:

یہ راستہ تو موٹر سے روندنے کے قابل نہیں، ہم اپنے آپ کو داعی کہتے ہیں، تو پھر کیوں سب سے بڑے داعی حق کے نقش قدم پر چلنے کی ہمت نہیں کرتے۔ یہی راستہ تھا، یہی گھاٹیاں ہوں گی، سرزمین یہی تھی، پہاڑیاں یہی تھیں۔ اب بھی وہی زمین ہے پہاڑیاں بھی وہی ہیں، لیکن پاکباز پیغمبر ﷺ کے نقش قدم پر چلنے والے راہ حق کے دیوانے کہاں ہیں۔"(۱)

یہ اس سوز و گداز اور والہانہ عشق و محبت کی جھلک ہے، جو مولانا کے جسم و روح میں موجود تھی، وہ دامے درمے قدمے سخنے اشاعت دین اور اس کے لیے زمین ہموار کرنے کے لیے نظر آتے ہیں۔ وہ دین اسلام کی سربلندی اور اللہ کے پیغام کو تمام انسانیت تک پہنچانے کے لیے ہمہ وقت تیار نظر آتے ہیں۔

زندہ رہے تو انسانیت اور اسلام کی خدمت کرتے رہے، اور موت بھی اسی حالت میں ہوئی کہ اسلام کی سربلندی اور اشاعت کے لیے اپنے آپ کو وقف کر چکے تھے۔

اس کتاب میں تحریک اسلامی کے کارکنوں کو کارکردگی اور عزیمت و استقامت کا ایک بہترین اور معیاری نمونہ مل سکتا ہے۔

●●

---

(۱) دیار عرب میں چند ماہ، مسعود عالم ندوی ص ۱۹۰

مکاتیب سلیمان

یہ علامہ سیّد سلیمان ندوی کے ان مکاتیب کا مجموعہ ہے جو انہوں نے مولانا مسعود عالم ندوی کے نام لکھے تھے۔ سیّد صاحب سے مولانا کی مراسلت کا سلسلہ تقریباً پچیس برس پر محیط ہے اس دوران انہوں نے سید صاحب کے خطوط کو سنبھال کرر کھااور صرف ایک خط ضائع ہوا ہے۔ سیّد صاحب کی وفات کے فوراً بعد مولانا مسعود عالم ندوی نے ان خطوط کو کتابی شکل میں مرتب کیا، یہ ان کی آخری کتاب ثابت ہوئی اور ان کی وفات کے بعد شائع ہو سکی۔

مولانا مسعود عالم ندوی ان مکاتیب کے بارے میں لکھتے ہیں :

> ''گزشتہ ۲۵ رسالوں میں حضرت الاستاد کے قلم سے جو چیز بھی ملی اسے سینہ سے لگا کر رکھا۔ جہاں تک یاد پڑتا ہے صرف ایک مکتوب ضائع ہوا ہے۔ ''الضیاء'' کے زمانے میں عاجز نے ''عربوں کی جہاز رانی'' کا عربی میں ترجمہ کیا تھا، جو رسالے میں بالاقساط شائع ہو تا رہا۔ اس کی دوسری قسط پڑھ کر استاد مرحوم نے حوصلہ افزائی کے کلمات تحریر فرمائے تھے۔ جو نوعمری کی خوشی میں دوستوں اور ہم چشموں کو دکھاتے دکھاتے گم ہو گیا۔ جس کا آج تک افسوس ہے،اس کے علاوہ تین چار خط بالکل نجی معاملات سے متعلق تھے، انہیں اسی وقت ضائع کر دیا گیا تھا، موجودہ مجموعۂ مکاتیب میں بھی کہیں کہیں نجی معاملات کی طرف اشارے تھے، انہیں بھی حذف کر دیا گیا ہے مگر وہ سب ملا کر چار پانچ سطروں سے زیادہ نہیں۔''(۱)

(۱) مکاتیب سلیمان، مرتب مسعود عالم ندوی ص ۷

یہ مجموعہ اس حیثیت سے بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ تقریباً ربع صدی کے حادثات زمانہ کا اس میں ذکر ملتا ہے۔ یہ مراسلت ۱۹۲۸ء میں شروع ہوئی اور اگست ۱۹۵۳ء میں ختم ہوئی۔

علامہ سیّد سلیمان ندوی مرحوم سے اپنے تعلق کی ابتداء کا ذکر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> "استاد مرحوم سے مراسلت رمضان ۱۳۴۶ھ (فروری ۱۹۲۸ء) سے شروع ہوئی، اور اسی کے ایک مہینے بعد بہار شریف (پٹنہ) ریلوے اسٹیشن پر پہلی بار شرف نیاز حاصل ہوا۔ جبکہ وہ اپنے وطن دیسنہ سے اعظم گڑھ تشریف لے جا رہے تھے، اس تعلق کی ابتداء کچھ ایسے خلوص اور عقیدت کے ساتھ ہوئی کہ مسلسل ۲۵۔۲۶ر سالوں تک اس میں فرق نہیں آیا۔ دن بدن محبت و عقیدت بڑھتی گئی، اور حضرت الاستاذ کی طرف سے بھی شفقت و نوازش میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔" (۱)

اس مجموعہ میں کچھ خطوط نجی طرز کے ہیں اور کچھ علمی طرز کے ہیں۔ ندوۃ العلماء کی سیاسیات اور معاملات کے تعلق سے بعض خطوط میں کہیں عربی ماہنامہ "الضیاء" کا تذکرہ ہے، مفید مشوروں کا ذکر ہے، اشاعت و طباعت کے تذکرے ہیں، تصوف اور علم سلوک کے مسائل کے بارے میں بھی چند مکاتیب ہیں، اختلاف مسلک و فکر کا تذکرہ بہت ہی کم ملتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ مولانا مسعود عالم ندوی نیاز مندی اور وفا شعاری کے دامن کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے، جیسا کہ کتاب کی ابتداء میں لکھتے ہیں:

> "اس ربع صدی میں بڑے بڑے انقلابات آئے، حوادث نے افکار و خیالات کی دنیا ہی بدل دی۔ اختلاف مسلک و فکر (جماعت اسلامی میں

---

(۱) مکاتیب سلیمان، مرتب مسعود عالم ندوی ص۹

شمولیت کی طرف اشارہ ہے) سے بھی دوچار ہونا پڑا۔

دار العلوم ندوۃ العلماء کے نظم وانصرام کے باب میں بھی راہیں مختلف ہوتی نظر آئیں، مگر الحمد للہ کہ اس گنہگار نے نیاز مندی اور وفا شعاری کے باب میں کبھی کوتاہی نہیں کی، ایک مرتبہ اختلاف نظر وفکر کا ذکر کرتے ہوئے میرے ایک مخلص دوست "جو میری ہی طرح استاد مرحوم کے شاگردوں اور ارادت مندوں میں ہیں" سے فرمایا:

مسعود باغی ہے مگر وفادار، استاد مرحوم کے یہ ارشادات خادم کے لیے سرمایہ ناز ہیں، اور اس لیے انہیں یہاں یادگار کے طور پر درج کر رہا ہے۔"(۱)

اس مجموعۂ مکاتیب میں مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کے مشغلہ اور ذوق کی مناسبت سے موضوع بھی بدلتے گئے ہیں۔

اس کے پہلے پانچ خطوط عربی زبان میں ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ پہلے پانچ خطوط مسعود صاحب نے عربی زبان میں استاد مرحوم کو لکھے تھے۔ جن میں استاد مرحوم سے عربی زبان وادب میں مشورہ طلب کیا تھا، اور رہنمائی کی درخواست کی تھی۔

اس کے بعد ۳۲ر خطوط اس زمانے کے ہیں، جبکہ عربی رسالہ "الضیاء" کی ادارت کے لیے مسعود صاحب کا انتخاب کیا گیا، اور مئی ۱۹۳۲ء سے الضیاء جاری ہوا، اور تقریباً چار سال جاری رہا۔ ان ۳۲ر خطوط میں الضیاء کے سلسلے میں ہدایات اور علمی استفسارات کے جواب بھی موجود ہیں، ندوۃ العلماء کی اندرونی سیاست کے متعلق بھی دو خط ہیں۔

اس کے بعد ۵۱ر خطوط خدا بخش لائبریری پٹنہ کے سلسلے میں یا ملازمت کے دوران کے ہیں۔ ان خطوط کے موضوع بہت متنوع ہیں۔ خالص علمی مظامین سے لے کر ندوۃ العلماء کی داخلی سیاست کا بھی ذکر ہے۔

انجمن طلبہ قدیم ندوہ، انجمن معین الندوہ، سیرت محمد بن عبدالوہاب، مولانا سندھی پر تنقید، اشتراکیت اور اسلام اور اسی طرح کے مختلف علمی کاموں کا ذکر بار بار آیا ہے۔ کہیں

---

(۱) مکاتیب سلیمان، از مسعود عالم ندوی ص ۱۰

کہیں جماعت اسلامی کا بھی ذکر آتا ہے۔

اس کے بعد ۴۲؍ خطوط میں جماعت اسلامی اور تصوف کا ذکر خاص کر آتا ہے، تصوف اور تزکیہ سے متعلق بعض مکاتیب نہایت قیمتی ہیں۔ بقول مولانا مسعود عالم ندوی کہ:

"وہ بڑی بڑی تصانیف پر بھاری ہیں۔"(۱)

مولانا مسعود عالم ندوی کا جماعت اسلامی کے قائدین میں شمار ہوتا تھا، اس لیے خیال پیدا ہوتا ہے کہ جماعت اسلامی کے تعلق سے بہت سے خطوط ہونے چاہئیں۔ لیکن جماعت اسلامی کا ذکر جیسا کہ گزر چکا ہے، بہت کم ملتا ہے، اس کی وجہ مسعود عالم ندوی صاحب خود لکھتے ہیں:

> "دوسری چیز جس میں خادم نے اپنے کو مخدودم سے الگ پایا۔ وہ جماعت اسلامی اور تحریک اقامت دین کی شرکت ہے، تصوف و سلوک کے بارے میں حضرۃ الاستاذ سے بیسیوں مرتبہ گفتگو ہوئی لیکن جماعت اسلامی کے سلسلے میں راست گفتگو سے بچتا رہا، البتہ طرح طرح سے یہ کوشش کی کہ ان کی بدگمانیاں دور ہوں اور وہ زیادہ سے زیادہ ہمارے موقف کو سمجھیں اور میرا اپنا اندازہ ہے کہ اپنی کوشش میں میں ناکام نہیں رہا۔"(۲)

کتاب کے آخر میں انڈکس بھی ہے، جو مولانا کی وفات کے بعد ان کے شاگرد رشید محمد عاصم صاحب نے تیار کیا ہے۔

اشخاص، کتب، علمی مدارس اور دوسرے اہم مقامات کا اس کتاب میں جہاں جہاں اور جتنی بار ذکر آیا ہے، اسے صفحہ وار اس انڈکس میں درج کر دیا گیا ہے۔ علمی کام کرنے والوں کے لیے یہ ایک نعمت غیر مترقبہ ہے، اور اس سے اس مجموعۂ مکاتیب کی علمی افادیت میں ایک اہم باب کا اضافہ ہوا ہے۔

---

(۱) مکاتیب سلیمان، از: مولانا مسعود عالم ندوی ص: ۱۲

(۲) ایضاً ص: ۱۶

محاسن سجاد

یہ کتاب حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد رحمۃ اللہ علیہ کی سیرت اور خدمات سے متعلق چند اہم مضامین کا مجموعہ ہے۔

۱۸ر نومبر ۱۹۴۰ء کو مولانا محمد سجاد صاحب کا پھلواری شریف ضلع پٹنہ میں انتقال ہوا۔ مولانا مسعود عالم صاحب کو ان سے انتہائی محبت و عقیدت تھی۔ ان کا حد درجہ نہ صرف احترام کرتے تھے، بلکہ ان کے مشوروں پر عمل بھی کرتے تھے۔

کتاب کے ابتدائی لفظوں سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ مسعود صاحب کا ان سے کتنا گہرا تعلق تھا، لکھتے ہیں:

> ”حیران ہوں کیا لکھوں؟ مجموعہ کے لیے (مولانا کی یاد میں) لکھنے بیٹھا، تو کچھ لکھ نہ سکا، سچی بات یہ ہے کہ قلم جذبات کا ساتھ نہ دے سکا، کچھ رفاقت کی تو آنسوؤں نے لیکن آپ جانتے ہیں کہ لکھنے پڑھنے کے معاملے میں آنسوؤں کی رفاقت کام نہیں دیتی، اب لکھنے بیٹھا ہوں تو پانچ مہینوں کے بعد پھر دل کی گہرائیوں سے ہوک سی اٹھتی معلوم ہوتی ہے، آگے پیچھے نظر ڈالتا ہوں تو مولانا محمد علی مرحوم کا یہ غیر فانی شعر زبان پر آتا ہے ؎
>
> یہ حالت ہوگئی ہے ایک ساقی کے نہ ہونے سے
> کہ خم کے خم بھرے ہیں مے سے اور میخانہ خالی ہے“ (۱)

---

(۱) محاسن سجاد، مصنف مولانا مسعود عالم ندوی ص: ج:

پھر جنوری ۱۹۴۱ء میں ماہنامہ الہلال پٹنہ کا "سجاد نمبر" شائع کرنے کا فیصلہ کیا گیا، مگر حالات کچھ ایسے ہوئے کہ الہلال کی اشاعت ہی ملتوی ہو گئی۔ اس کے بعد سجاد نمبر کے بدلے "محاسن سجاد" کی تجویز سامنے آئی، اس طرح سے اپریل ۱۹۴۱ء میں "محاسن سجاد" کے نام سے یہ کتاب مرتب ہوئی۔ اس میں سب سے پہلے مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم کا لکھا ہوا پیش لفظ ہے۔ اس کے بعد مرتب کے قلم سے "تقریب" کے عنوان سے اس مجموعے کے شائع کرنے کا مقصد اور مناسبت کو بیان کیا گیا ہے۔ "ذاتی حالات" کے عنوان کے تحت چار مضامین شامل کیے گئے ہیں۔

ایک مولانا حافظ عبدالحکیم صاحب اوگانوی مہتمم مدرسہ انوار العلوم گیا، کا ہے۔ دوسرا مضمون جناب زکریا فاطمی صاحب مدیر "الہلال" کا ہے۔ تیسرا اور چوتھا بالترتیب مولانا اصغر حسین صاحب اور حکیم یوسف حسن خاں صاحب کا ہے۔

محاسن کے تحت علامہ سیّد سلیمان ندوی، ڈاکٹر سیّد محمود صاحب، مولانا امین احسن اصلاحی صاحب اور مولانا منظور نعمانی صاحب کے مضامین ہیں ایک اہم مضمون "مولانا کی یاد میں" کے عنوان سے مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کے اپنے قلم سے بھی ہے اور آخر میں "نقصان عظیم" کے عنوان سے سیّد احمد عروج قادری صاحب کی ایک نظم بھی شامل ہے۔

کتاب کے اکثر مضامین میں مولانا مسعود عالم ندوی نے اپنی طرف سے حاشیہ بھی لگایا ہے اور بڑی محنت و کاوش سے اس کتاب کو مرتب کیا ہے۔

اس کتاب کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اس میں مولانا سجاد مرحوم کے متعلق مولانا راغب احسن اصلاحی (سکریٹری کلکتہ مسلم لیگ) کا ایک اختلافی مضمون شامل ہے، اس کے متعلق پیش لفظ میں مولانا عبدالماجد دریابادی نے لکھا ہے:

"سارے مجموعہ میں ایک مضمون عجیب سا نظر آیا، وصل میں فصل کا نقشہ، بزم میں رزم کا جلوہ! قلم کی گردش میں شمشیر کی برش کا تماشا!

......اور پھر مضمون کا جواب اسی انداز میں! وہی ردیف وہی قافیہ، وہی رجز خوانی وہی دم داعیہ۔" (۱)

مولانا مسعود عالم ندوی لکھتے ہیں:

"راغب احسن صاحب کا مضمون شاید بہتوں کے لیے تکلیف دہ ہو۔ پر حالات کچھ ایسے ہوگئے کہ اس کی اشاعت ناگزیز ہوگئی۔ راقم کے اصرار اور مسلسل درخواست پر برادر مکرم راغب احسن صاحب نے یہ مقالہ عنایت فرمایا اور پھر جب ان سے لہجہ نرم کرنے کی اور کچھ ترمیم و تبدیلی کی درخواست کی گئی، تو وہ راضی نہ ہوئے، مجبوری میں ایک مفصل نوٹ آغاز میں دے دیا گیا۔

طباعت سے پہلے بعض دوستوں کی نظر اس پر پڑی، تو وہ اس نوٹ پر بھی مطمئن نہ ہوئے۔ آخر ان کے اصرار سے برادرم جناب شمسی ہاشمی کا جوابی مضمون بھی شامل کرلیا گیا۔ اور اس طرح "کتاب المناقب" میں "باب الجدل" کا مستقل اضافہ ہوگیا۔ جس کا ہمیں انتہائی رنج ہے۔" (۲)

---

(۱) محاسن سجاد، مصنف مولانا مسعود عالم ندوی ص: ز

(۲) محاسن سجاد ص:

مسعود عالم ندوی کے مرتب کردہ کیٹلاگ

مولانا مسعود عالم ندوی اگرچہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کی علمی فضا ہی میں رہنا چاہتے تھے، اور کسی طرح بھی ان کے ذہن میں ندوۃ العلماء چھوڑنے کا خیال نہ تھا، اور یہی خواہش ان کے استاد مکرم علامہ سیّد سلیمان ندوی کی بھی تھی، لیکن کچھ ایسے واقعات پیش آئے کہ ندوۃ العلماء میں ان کا رہنا محال ہو گیا۔

سب سے اہم واقعہ جو پیش آیا، وہ ندوۃ العلماء میں طلباء کی اسٹرائک کا تھا، اس اسٹرائک کے نتیجے میں تین طلبہ اور ایک مدرس کو دارالعلوم ندوۃ العلماء سے خارج کیا گیا۔[۱]

مولانا مسعود عالم ندوی کو اگرچہ خارج نہیں کیا گیا، لیکن دارالعلوم کے احاطے سے باہر رہنے کا حکم ہوا۔ اصل میں ندوۃ العلماء کے نظم و نسق میں کچھ ایسے لوگ آ گئے تھے، جو طلبہ پر اپنا علمی رعب نہ رکھنے کے باوجود یہاں کے نظم و نسق میں من مانی کارروائیاں کرنا چاہتے تھے، ندوۃ العلماء کو اپنے اصولوں سے ہٹا کر دیوبند کی قسم کا ایک خالص مذہبی مدرسہ بنانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس رجحان کو مسعود صاحب اور کچھ دوسرے مدرسین اور طلباء کی ایک بڑی تعداد بری طرح سے محسوس کر رہی تھی، اسی سلسلے میں یہ اسٹرائک ہوئی تھی۔

اب مسعود صاحب ندوۃ العلماء کی زندگی سے تنگ آ چکے تھے، اور وہ موقع کی تلاش میں تھے، چنانچہ جون ۳۷ء میں انہیں موقع ملا اور وہ تین ماہ کی رخصت لے کر بجنور چلے گئے، اور وہاں مدینہ اخبار کے اسٹاف میں شامل ہو گئے۔

سیّد صاحب نے ندوہ واپس آنے پر جب بہت اصرار کیا تو اس شرط پر واپس آ گئے کہ سیّد صاحب ناظم دارالعلوم کو از خود یہ لکھیں کہ مسعود صاحب میرے حکم سے ندوہ واپس آ رہے ہیں۔ ندوہ واپس آنے کے بعد بھی ان کا دل وہاں نہ لگا، اور وہ پہلے کی طرح

مایوس رہنے لگے، اسی اثناء میں پٹنہ کی اورینٹل لائبریری کے مرتب فہرست (کٹیلاگر) مولوی عبدالحمید صاحب کا انتقال ہو گیا، اور وہاں کے سکریٹری نے سیّد صاحب کو ایک آدمی کے لیے لکھا۔ سیّد صاحب نے مسعود صاحب کو اس کام کے لیے بہترین آدمی پایا۔ چنانچہ سیّد صاحب نے مسعود صاحب کو لکھا کہ لائبریری کے سکریٹری کو درخواست بھیج دیں۔ چنانچہ ایک خط میں جو کہ ۹/ ستمبر ۱۹۳۷ء کا ہے لکھتے ہیں:

"آپ کتب خانوں کی کٹیلاگ نویسی کا کام کر سکتے ہیں، تھوڑے مطالعہ اور توجہ کی ضرورت ہے، قدیم نسخوں کو جانچنا، مختلف مکاتب عالم پر نظر، کتابوں کے نامعلوم مصنفوں کا پتہ لگانا یا ان کا زمانہ متعین کرنا، نوادر کتب پر اطلاع، یورپ، مصر اور قسطنطنیہ کی فہرستوں پر کامل عبور، خط کی پہچان، کاغذوں کی شناخت، علم الخطوط سے آگاہی۔ یورپ کے مشہور کٹیلاگوں کا مطالعہ، اور ان کے طرز تحقیق و تلاش کا اتباع اور ان کی صحت و خطا نقد، نادر نسخوں کی وجہ ندرت کی تمیز، مصنفوں کے حالات کا سراغ لگانا، تھوڑی مہارت میں یہ کام انجام پانے لگ سکتا ہے۔ کشف الظنون، فہرست ابن ندیم، مدینۃ العلوم اور یورپ کی فہرستوں کو دیکھنا مشکل کو حل کر دیتا ہے۔" (۱)

چناں نچہ مسعود صاحب نے درخواست دی، اور وہ منظور ہو گئی۔ اس طرح وہ ندوۃ العلماء کے علمی ماحول سے دور ایک دوسرے علمی ماحول میں چلے گئے، ۱۶/ دسمبر ۱۹۳۷ء کو مسعود صاحب نے پٹنہ آکر لائبریری کا کام شروع کر دیا، اور یہ کام سات سال تک جاری رہا۔

(دسمبر ۱۹۳۷ تا اکتوبر ۱۹۴۴)

کیٹیلاگ

مولانا مسعود عالم ندوی نے CATALOGUE کو مجموعے کی شکل میں تقسیم کیا ہے۔ یعنی ایک مجموعے کے تحت کئی کتابیں آگئی ہیں۔ مختلف موضوعات پر اور مختلف مصنفوں کی۔

اور سب سے اوپر یعنی مجموعے کے ابتداء میں تمام کتابوں کے جتنے صفحات ہوتے ہیں، ان کا ذکر کرتے ہیں۔ پھر صفحات میں کتنی سطریں ہیں، ان کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ پھر کتاب کے سائز کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ مثلاً ایک مجموعے کی ابتداء بہت ہی مختصر یوں کرتے ہیں:

FOLL. 290. LINES. 17

SIZE 8 1/2 X 5; 6X3

AL-MAJMUAH.

A MAJMUAH CONSISTING OF THIRTEEN WORKS ON DIFFERENT SUBJECTS BY DIFFERENT AUTHORS.

ایک دوسرے مجموعے کی ابتداء ان الفاظ سے کرتے ہیں:

A VERY CORRECT, OLD AND VALUABLE MANUSCRIPT CONTAINING SEVEN TREATISES ON DIFFERENT GRAMMATICAL TOPICS.

ان کیٹلاگ میں ایک خاص بات یہ ہے کہ جس جس کتاب کا تعارف پیش کرتے ہیں۔ اس کے ابتدائی الفاظ بھی نقل کرتے ہیں، اور کسی کسی کتاب کے تو آخری الفاظ بھی نقل کرتے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا کا مطالعہ زبردست اور عمیق تھا اور جس جس کتاب کے بارے میں انہوں نے لکھا ہے، اس کا بغور مطالعہ کیا ہے، اس کے ایک ایک حرف

کو دیکھا ہے۔

ورنہ ممکن نہیں تھا کہ کتاب کے نشیب و فراز کو بیان کرتے، اور کہیں کہیں اس کا بھی ذکر ملتا ہے کہ کتاب کا فلاں صفحہ خالی ہے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ اکثر کتابوں کے بارے میں لکھتے ہیں کہ آیا اس کا ایک ہی نسخہ ہے یا کئی نسخے ہیں۔ یہ وہی شخص بتا سکتا ہے، جس کی نظر دنیا کے تمام کتب خانوں پر ہو اور جس نے باقاعدہ چھان بین کی ہو۔

تیسری اہم بات یہ ہے کہ مصنف کے حالات بھی مختصراً بیان کیے ہیں، جو اس بات کی دلیل ہے کہ مولانا نے ہر کتاب کے مصنف کے بارے میں جاننے کی کوشش کی ہے، اور اس کے حالات کی باقاعدہ تحقیق کی ہے۔

اس کے بعد ان کے حالات کو قلم بند کیا ہے جو کہ تحقیق کے میدان میں کام کرنے والوں کے لیے نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں ہے۔

اگر ہم غور کریں تو یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ مسعود صاحب نے اس سلسلے میں کتنی جانفشانی سے کام کیا ہوگا۔ انہوں نے تقریباً ساڑھے آٹھ سو کتابوں کے بارے میں لکھا ہے جو معمولی کام نہیں ہے۔

چند نمونے بطور مثال پیش کیے جاتے ہیں:

NASIM AS SAHAR

A VERY RARE AND USEFUL WORK TREATING OF THE PROPHET'S LIFE AND TEACHING FROM A MYSTICAL POINT OF VIEW WITH SPECIAL REFERENCE TO HIS COMMENDABLE DEEDS MANNERS, AND CHARACTERS.

BY THE SAME ABDUL KARIM AL JILLI

BEGINING

الحمد لله مبدء المعانی والصور و مبین آثار کماله الکامل الآثر

اما بعد

فهٰذه رسالة سماها لسان القدر بکتاب السحر عرض بالروض ثم عبر علیه من المسبك اثر ـ الخ

WE LEARN FROM THE AUTHORS PREFATURY NOTE.

FOL. 114B) THAT THE PRESENT TREATISE IS REALLY THE 12th PRAT OF HIS VOLUMNOUS WORK ON THE PROPHETS LiFE ENTITLED.,

کتاب الناموس الاعظم القاموس الاقدم فی معرفة قدر النبی ﷺ

SEE ALSO INDIA OFFICE, 664

THE WORK HAS BEEN MENTIONED IN BROCK 206 AND CAIRO, 11 119 VIT 273 UNDER THE TITLE.

لسان القدر بکتاب

نسیم السحر

WHICH IS OBVIOUSLY INCORRECT

THE WORK IS DIVIDED INTO TWELVE WITH ONE PARTICULAR ASPECT OF THE PROPHET'S LIFE OR TEACHINGS.

I FOL. 115

الفصل الاول فی سر تخلیة و اعتزالیه عن الناس لانفراده برأیه

II FOL. 116.

الفصل الثانی فی سر رعیه الاغنام والشاة زمن الصبا ودرك الاحلام

الفصل الثالث فی سر سفرہ الیٰ ارض شام III FOL. 117

الفصل الرابع فی سر قولہؐ جعل رزقی تحت رمحی IV FOL. 120

الفصل الخامس فی سر قولہؐ المرء حیث یضع نفسہ. V FOL. 121

الفصل السادس فی منزلہؐ فی تخییب النساء و VI FOL. 122

تکثرہ من الزوجات و کون من احب منھن حل لہ نکاحھا فی محکم الآیات ۔ الخ

الفصل السابع فی تحبیب الطیب الیہؐ VII FOL , 124.

الفصل الثامن فی سر جعلہ قرۃ عینہ فی الصلوٰۃ علیہ VIII FOL. 125

اکمل الصلاۃ والسلام

الفصل التاسع فی سرہ شوقہؐ الی اخوانہ الذین من بعدہ IX FOL. 126

الفصل العاشر فی سر قولہؐ الی وقت لایسعنی X FOL. 127

فیہ ملك مقرب ولا نبی مرسل۔

الفصل الحادی عشر فی سر قولہؐ لااحصیٰ ثناء XI FOL. 128

علیك انت کما اثنیت علی نفسك

الفصل الثانی عشر فی سر قولہٗ عند انتقالہ من XII FOL. 129.

دارالدنیا الی دارالآخرۃ فی الرفیق الاعلیٰ من الجنۃ و کون ذالك آخرہ۔

OTHER COPIES OF THE WORK HAVE BEEN NOTICED IN CAIRO LOC CIT. SEE ALSO BROCK SUPPL. II 284(1)

نمونہ کے طور پر چند کتابوں کی تفصیل دی جاتی ہے۔ تاکہ اس بات کا اندازہ ہو سکے کہ کتنی محنت اور لگن سے مولانا نے ان کیٹلاگ کو مرتب کیا ہے۔

یقیناً یہ ایک بہت بڑا کارنامہ ہے اور تحقیق و تفتیش کے میدان میں کام کرنے والوں کے لیے ایک نہایت ہی کارآمد چیز ہے۔

Catalogue. No. 26. Page.11.12 (1)

تحذير أئمة الاسلام عن تغيير بناء البيت الحرام

TAHDIR A, UMMAT AL ISLAM AN TAGYIR BINA BAIT AL HARAM.

A very rare copy of a short and useful work warning against introducing alteration in the structure of Kabah.

The work is based on Hadis and saying of eminent Jurists, especially of the Shafiite School, by wajihaddin Abdarrahman bin Abdalkarim bin Ibrahim bin Ali bin Ziyad Al, Gasis Al, Muqsiri Az, Zabidi Ash, Shafi.

وجيه الدين عبد الرحمن بن عبد الكريم بن ابراهيم بن علی بن زياد الغيسی المقصری ألزبيدی الشافعی.

BEGINNING.............الحمد لله رب العالمين وبه الاعانة

اما بعد: فقد كتب إلى بعض محققي الحجاز أنه حصل اختلاف بين فقهاء مكة فی جوار هدم شئی من الكعبة المشرفة.

The author, one of the most prominent scholars of the 10th century A.H., was born in Zabid (YEMAN) in Rajab, 900/ April 1419. He first learnt to recite the Quran and commited it to memory. He completed his study under Shaikh Al Islam Abul Abbas Ahmad bin At Taiyab At Tanblawi, (D 948/1541,: for his life see An Nur As Safir Foll 116-2 228) and other eminent scholar of the place.

Afterwards he took to the profession of teaching and giving religious instructions to enquires. He performed the Hajj pilgrimige in A.H. 942/1536 and achieved the benefits of association with the learnedmen of the holy cities. After his

return from the pilgrimage, his fame travelled far and wide and students flocked to his lectures. He succeeded his teacher Abul Abbas at Tanblawi (d- 948/1541), after his death as a teacher and jurist. He lost his eyesight in 964/1557, but inspite of this he continued his cherished work with the help of his learned son Shaikh Abdassalam who died a few months after his father in Shawwal, 975/APRIL, 1568. (See An- Nur as, Safirfoll 160b161. Brock. suppl, 11555, place his death in A.H. 973).

He wrote more than thirty works in refutation of some of his contemporaries also (see An Nur as Safr fol 157). According to An Nur as Safr fol 155). Some of the prominent scholars of the time were of the opinion that the works of the present author were more instructive and thought provoking than those of his contemporary IBN HAJAR AL HAISAMI (d, 974/1576)

He died on 11, RAJAB (975/ JAN,1568).

For further particulars of his life see An Nur as, Safir foll, 155---160. see also brock, 11,404 and suppl. Where thirty one of his works are enumerated, fails to mention any one of his works.

The above title is given in Cairo 392, An Nur As-Safir and brock loc, cit.

There is however a note by the Scrible, indicating that the present ms, is by Ibn Ziyad al Waji on the question of addition to the structure of the Kabah and its consquences, which reads (Fol, 139b.)

مؤلف لابن زياد الوجيه في حكم الزيادة على

بناء الكعبة وما يترتب على ذلك من الأمور الصعبة:

The author's name also does not appear in the main body of the ms. But the following note in the end (fol 145a) by the scribe.

انتهىٰ جواب الفقيد العلامه المحقق الفهامة وجيه الدين عبد الرحمن بن عبدالكريم بن زياد نفع الله به وبعلومه.

Leaves on doubt as to its authorship, This is strengthened by a reference by the author in the ms (fol 143a) to Shaikh al Islam Abul Abbas Ahmad bin at taiyab at tanblawi, (d,948/1541) as his teacher in the following term.

وفى فتاوى شيخنا شيخ المذهب والاسلام الشهاب أبى العباس احمد بن طيب البكرى الطنبلاوى. الخ

All this settles definitely that the present work is تحذير أئمة الإسلام تغيير بناء بيت الحرام of Wajihaddin Ibn Ziyad.

The only copy of the work to be known is noticed in Cairo, loc, cit.

The handwriting is similar to that of the previous ms.

DATED. RAMDAAN 1121/1709

Fol. 145b is blank. (1)

●●

---

(1) Catalogue. No. 26. Page101

الفتاوى المباركة

A very rare copy of an important work on Muslim law, consisting of two sets of judicial decisions on legal questions by two different Scholars. The decisions were (فتاوٰی) given in answer to questions addressed from Yemen to two eminent authorities of the time (10th century) living then at Macca and belonging to Shafi school of Muslim law viz Abul Hasan Albakri ابوالحسن البکری and Ibn Hajar Al-Haisami ابن حجر الهیثمی The answer of the two scholars bear seperate titles. The complier has combined the two into one. Each question is followed first by the reply of Al, Bakri and then by that of Ibn Hajar al Haismi.

The name of the compiler does not occur anywhere in the ms. Authors:- The letter of the two scholars viz Ibn Hajar Ai Haisami (d.974/1567) is a well known authority on Hadis and Fiqh see no 2801/1 above and 2801/12 below. The former Abul Hasan Bakri a very prominent sufi and scholar of his age, whose full name (as recorded in the ms foll. 153b--219b and An-Nur as Safir Foll/ 211a) is Muhammad Bin Muhammad bin Abdarrahman bin Muhammad bin Al Bakri as Siddiqui Ash Shafie Al Ash,ari, air sibt- Al- Hasan. محمد بن محمد بن عبد الرحمن بن محمد البکری الصدیقی الشافعی الاشعری سبط آل حسن better known as Abul Hasan Al bakari ابو الحسن البکری was born in 899/1493. Born and bred in a highly learned family in Egypt, he soon made his mark and became well - known for his piety and learning.

He used to visit Makka very frequently and spend there a considerable part of the year. Students flocked to him at both places and benefited by his scholarship.

He also delivered lectures at Mednia and Jerusalem. Ibn Hajar Al Haisami and most other prominent scholars of the 10th century A.H. were among his puplis, according to An. Nur as safir for 218, he composed more than four hundred works, is his مختصر فی الفقة highly spoken of by the author of An. Nur as Safir, and commented upon by prominent scholars like Ibn Hajar al Haisami. See no 2801/12 and others. In all 25 works of him are enumerated in brock. His death took place in 952/1545/

For other particulars of his life see An.Nur as Safir foll. 217-20.

An account of his life is also given in TARIKH MUHAMMADI, foll, 699 of Mirza Muhammad Harisi.

The compiler does not reveal himself anywhere in the ms. It is however evident from his reference to Abul Hasan al Bakri as his teacher and other references in the introduction quoted below that he was a scholar of the 10th century A.H and belonged to southern part of Arabia.

The process of each question, being followed first by the reply of Al-Bakri and then by that of Ibn Hajar, is continued throughout the work.

A note on the cover in an other hand calls the work, المرأ الاخضر فی فتوی ابن حجر Which is not correct in view of the work of Al Bakri's also being included in the same.

The above title, i.e. الفتاوی مبارکة has been derived from the concluding portion of the compiler's note at the end which runs thus fol. 219:

واللہ اعلم تمت الفتاوی المبارکة بحمد اللہ وحسن توفیقه والحمدللہ رب العالمین

The questions mainly relating to four kinds, have been arranged under the following 4 fasls.

الفصل الاول: فی مایملك من المیاہ المباحة ومالا یملك.

الفصل الثانی: فی ما یتعلّق بحکم الاراضی التی تشرب دفعة واحدة.

الفصل الثالث: فی ما یتعلّق بحکم الاراضی التی تشرب علی التعاقب.

الفصل الرابع: فی ما یتعلق بحکم انقسام الماء بین الشرکاء فی مواقی متعدّدة.

The remaining questions and answers on miscellanious points have been arranged under a Khatimah, according to the arrangement generally adopted in the works on Fiqh.

In the following notes at the end of the answers of each of the two scholars, the complier goes to testify that all the answers were replied by the two scholars as arranged alternatively, those of Al Bakri preceding, written in Arabic Naskh. Not dated, probably 11th century A.H. There are also occasional marginal notes indicating the views of certain other scholars of the time on the points discussed in the text.(1)

●●

Catalogue. No. 26. Page104(۱)

TARJUMAH IBN HAJAR ترجمة ابن حجر

A copy of a very valuable composition on the life and works of Ibn Hajar al Haisami throwing fresh light on the achievements of this renowned scholar of the 10th century A.H. by Abu Bakar bin Muhammad bin Abdullah Ba Amr ابوبکر محمد بن عبد الله باعمرو! one of the most favourite pupils of Ibn Hajar, who was closely-attached to him till the time of his death.

No dates of the life are known. It is however evident from the fact that he discribes himself (fol.265b) as a pupil of Ibn Hajar and was alive at the time of his death i.e. 974 A.H. That he flourised in the latter part of the 10th century A.H.

BEGINNING

يقول الفقير إلى فضل الله ابو بكر بن محمد بن عبد الله باعمرو
الحمد لله رب العالمين. اما بعد: فهذه الورقات تتضمن
ترجمة شيخنا المجدد شهاب الدين ومعرفة مولده
وفاته ومصنفاته وشئى من مناقبه ـــ الخ

Thus, this short work containing on account of Ibn Hajar's life and works by one of his pupils.

See the introduction quoted above is the most authentic and authoritative document on the subject.

Among many other valuable pieces of information, it establishes the exact dates of his life beyond any doubt.

In the following account, the author of the treatise says that he saw, in Ibn Hajar's own hand writting that he was born towards the end of 909/1504;-

ولد رحمة الله تعالى ورضى عنه كما شاهدته بخطه
بحملة ابى الهيثم بعد انتقال اهله عن بلدهه
الاصيلة سلمنت او اخر سنة تسع وتسعمائة. (1)

●●

Catalogue. No. 26. Page111(۱)

رسالة فی الاعتقاد

A very useful work on theology, dealing mainly with the attributes of God. Whether an attempt should be made at their explanation or not?

The author is strongly of the opinion that they should be accepted as they stand, avoiding any doubt of (TAKYIFتکییف) e. g. assumption of qualities and qualifications) or TAMSILتمثیل e.g. representing by an image.

The present work originally narrates the proceeding of the three assemblies of discussion المجالس الثلاثة which were held in Egypt in the beginning of Rajab, 705,January, 1306, and the questions were put to the author by this Egyptian contemporaries regarding his faith, by الامام ابن تیمیه الحرانی

d 728 / 1328

The ms, neither bears the author's name nor the title.

But the internal evidence of the work leaves no doubt as to its authorship.

The proceedings of the three assemblies as narrated by the author in the present M.S agree fully with those stated by Ibn Hajar al Asqalani in his biographical sketch of Ibn Taimiyah.

Not dated. Apparently beginning of the thirteenth century A.H the handwritting being identical with that of the preceding Mss. See no, 2828 / 4 / below.

●●

BEGINNING

الحمد لله ربّ العالمين....................

أما بعد: فقد سئلت غير مرة ان اكتب ما حضرني ذكره مما جرى في المجالس الثلاثة العقودة للمناظرة في أمر الاعتقاد ....

فهذا جزء لطيف في بيان مذهب السلف والخلف من علمائنا في اثبات الصفات الله تعالى كاليد والوجه والعين والأفعال مع اعتقاد التنزيه ونفي التشبيه كما هو مذهب السادة الحنابلة.

فأقول ـ قال الامام الاعظم رحمة الله تعالى عليه رحمة واسعة ——— في الفقة الأكبر وله تعالى. الخ

●●

اجوبة عن أسئلة

AJWIBAT-UN- AN, As, EILATIN

A rare copy of a short and useful treatise, consisting of answers to questions relating to miscellaneous points of Fiqh, according to the shafi school. It contains in all twelve questions and answers.

BEGINNING

هذه أسئلة سئل عنها العالم العامل الشيخ عبد الرحمن بن على الخيارى الشافعى نفع الله به وهى هذه ماقولكم رضى الله عنكم فى قول الفقهاء فى باب صلوة الجنازة تكره الصلوة عليها فى المقبره. ثم قالوا بعد ذالك، يستعجب لمن حضر بعد الصلوٰة و قبل الدفن ان يؤخذ صلاته عليها الى مابعد الدفن مع ان هذه صلاة عليها فى المقبرة ، هل بين العبارتين تناف، فاجاب بما صورته الحمد لله الهادى الى الصواب الجواب، كلامهم الثانى مفيد للاطلاق فى الاول، لان ذالك ثبت من فعلهٗ فلا ثانى .... الخ

Author. Abdur Rahman bin ali bin Musa bin Quadir al khiyari ash shafi

A prominent scholar of the eleventh century A.H. He studied in Egypt under such eminent scholars of the place 95 Nuruddin az Zayyadi (d,5.3.1024/24. 3/16 Khulast al Asar 111-195-97).

Abu Bakar Ash Shinwani (d Dulhijjah, 1019 February, 1611, Khulasat al Asar,1, 79-81) and others.

He subsequently became a lecturer at al Azhar university, where students flocked to his lectures and a large numder of

reputed scholars of whom Nuruddin Ash,shabramallis, (d, 1087/1676, see no. 2824/v above) is the most prominent who studied under him. He subsecuently emigrated to Medinah in the middle of Muharram, 1029/december, 1619, and settled there for the rest of his life, teaching and benefiting people by his profound and vast learning.

His death took place on 22nd Rabi 11, 1056/28-5-1646.

He was buried in AL, BAQi? For Further particulars of his life see Khulasat al Asar 11, 367-68.

The present M.S. is very valuable because it was transcribed during the life time of the author, as would appear from the sentence. فتح المسلمين بحياته in the following colaphon of thiscribe fol: 143 a.

The following marginal note fol:143.

نقل من خطه من غير زيادة ولا نقصان، نفعنا الله به و بعلومه و متع المسلمين بحياته

Indicates that it was collated with the autograph of the author.

The lower half of fol, 143a, and fol 143b, bears another set of short question and answers relating to miscellaneous points of Fiqh by the same author. It opens thus fol, 143a,

ماقولكم رضى الله عنكم فى السلم هل يصح فى الحشيش و الحطب والوحوش اولاً، الجواب ، الحمد لله الهادى الى الصواب، يقول كاتب هذه الاحدف الفقير عبدا ـحمن بن على الخيارى المرسلة من ناحية الشرق السلم فى الحشيش و الحد ب لايصح لعدم انضباطه ..... الخ

The present portion was also transcribed from an

autograph of the author during his life time, as appears from the following concluding remarks of the scribe fol, 143a.

نقل من خطه الشيخ عبدالرحمن الخيارى بلازيادة ولا نقصان فسح الله فى مدته مدةً

The hand writting is identical with that of rest of the M.S. Not dated. Apparently before 1056 AH, Not is brock

Fol 144a-------- 147a.

●●

مطبوعہ مضامین کی فہرست

دنیا میں اسلام "معارف جولائی ۱۹۳۹ء

شکیب ارسلان کی کتاب پر تبصرہ: معارف نومبر دسمبر ۱۹۳۸ء

شاہ ولی اللہ سے پہلے ہندوستان کی حالت: الفرقان شاہ ولی اللہ نمبر

ابن خلدون: الہلال، پٹنہ

کشمیر اور ہندوستانی مسلمان: روزنامہ اخبار "السجل" قاہرہ (۱)

مذابح المسلمین فی الہند: روزنامہ اخوان المسلمین: قاہرہ (۲)

دنیا میں اسلامی تحریکیں

ہندوستان میں دعوت اسلامی کی مختصر تاریخ (۳)

وہابیت، ایک دینی وسیاسی تحریک، الہلال، مئی۔ جون ۱۹۳۷ء

غیر مطبوعہ مضامین اور کتابچے

حاضر مسلمی الهند و غابرهم

تاثير الاسلام فى الشعرا لعزلى

تاريخ الدعوة الاسلاميه فى الهند (كتاب)

●●

---

(۱) بحوالہ چراغ راہ ص: ۱۳۶

(۲) ایضاً

(۳) یہ دو مقالے نومبر ۱۹۵۱ء میں جماعت اسلامی کے سالانہ اجلاس میں پڑھے۔ چراغ راہ ص: ۱۳۹

مراجع و مصادر

(۱) ہندوستان کا نظام تعلیم و تربیت : سیّد مناظر احسن گیلانی
ندوۃ المصنفین، دہلی ۱۹۵۴ء

(۲) علماء ہند کا شاندار ماضی : سیّد محمد میاں، الجمعیۃ پریس ۱۹۷۵ء

(۳) ہندوستان میں عربی ادب اور علوم اسلامیہ کی تدریس و تحقیق
ڈاکٹر عبدالعلیم، علی گڑھ ۱۹۵۶ء

(۴) تاریخ دعوت و عزیمت، مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی
مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنؤ

(۵) ہندوستانی مسلمان ایک نظر میں۔ مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی
مجلس تحقیقات و نشریات اسلام۔ لکھنؤ

(۶) تحریک آزادی ہند اور مسلمان، مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ
اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ، لاہور

(۷) تاریخ ندوۃ العلماء : اسحاق جلیس ندوی، مکتبہ ندوۃ العلماء ۱۹۸۳ء

(۸) تنقیدی اشارے : آل احمد سرور، سرفراز قومی پریس، لکھنؤ ۱۹۴۲ء

(۹) عبیداللہ سندھی اور ان کے ناقد : مولانا سعید احمد، اکبر آبادی
سندھ ساگر اکادمی، لاہور ۱۹۴۹ء

(۱۰) مولانا عبیداللہ سندھی، محمد سرور، سندھ ساگر اکادمی، لاہور ۱۹۶۷ء

(۱۱) عربوں میں تاریخ نگاری کا آغاز اور ارتقاء، محمود الحسن
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی ۱۹۷۵ء

(۱۲) معلم الانشاء، الجزء الثانی : مولانا عبدالماجد ندوی، ندوۃ العلماء، لکھنو ۱۹۷۷ء

(۱۳) غالب کے خطوط، خلیق انجم، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۱۹۸۴ء

(۱۴) محمد بن عبدالوہاب ایک مظلوم و بدنام مصلح: مولانا مسعود عالم ندوی

مکتبہ نشاۃ ثانیہ، حیدر آباد، دکن ۱۹۴۷ء

(۱۵) مولانا سندھی کے افکار و خیالات پر ایک نظر، مولانا مسعود عالم ندوی

مکتبہ دین و دانش، پٹنہ

(۱۶) ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک : مولانا مسعود عالم ندوی

مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی ۱۹۸۱ء

(۱۷) مکاتیب سلیمان: مولانا مسعود عالم ندوی، مکتبہ چراغ راہ، کراچی ۱۹۵۴ء

(۱۸) دیار عرب میں چند ماہ : مولانا مسعود عالم ندوی، مکتبہ چراغ راہ، کراچی ۱۹۵۰ء

(۱۹) الترجمة العربية : مولانا مسعود عالم ندوی، مکتبہ چراغ راہ، کراچی ۱۹۵۴ء

(۲۰) نظرة اجمالية فی تاریخ الدعوة الاسلامية فی الهند و باکستان

مولانا مسعود عالم ندوی، قاہرہ ۱۳۷۲ھ

(۲۱) معارف، اعظم گڑھ، جولائی ۱۹۳۹ء

(۲۲) معارف، اعظم گڑھ، نومبر، دسمبر ۱۹۳۸ء فروری، مارچ ۱۹۴۲ء

(۲۳) الفرقان، لکھنؤ

(۲۴) الہلال، مئی۔جون ۱۹۳۷ء، (پٹنہ)

(۲۵) فاران (پاکستان) مارچ ۱۹۵۶ء ۱۹۵۷ء ۱۹۵۸ء

(۲۶) زندگی، رامپور، جولائی۔اگست ۱۹۸۴ء

(۲۷) چراغ راہ، کراچی خصوصی نمبر، ۱۹۵۵ء

(۲۸) چراغ راہ : مئی۔جون۔جولائی۔اگست ۱۹۵۶ء

(۲۹) پرانے چراغ : مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی: مکتبہ فردوس، لکھنؤ ۱۹۷۵ء

(۳۰) الندوہ: لکھنؤ، نومبر ۱۹۴۰ء جنوری ۱۹۴۲ء

(۳۱) الضیاء، لکھنؤ ۱۹۳۲ء تا ۱۹۳۶ء

Catalogue of the Arabic and persian Manuscripts in oriental public library.

By. Masud Alam Nadwi

The united Press LTD. PATNA

No. 25.26.27.28 1946

●●